احباب نوٹ فرمالیں

اس بار مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

سالانہ محاضراتِ قرآنی

ان شاء اللہ العزیز ۲۳ تا ۲۷ اپریل، قرآن آڈیٹوریم

۱۹۱۔ اے، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن میں منعقد ہوں گے

ان محاضرات میں

منہج انقلابِ نبویؐ

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس

کے پانچ خطابات ہوں گے۔ ہر خطاب کے بعد

محترم ڈاکٹر صاحب اہل علم و دانش حضرات پر مشتمل ایک پینل کے سوالات

کے جوابات دیں گے۔

شرکت کی عام دعوت ہے

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا
(البقرہ: ۲۶۹)

ادارہ علوم اسلامیہ ... اکیڈمی
20-4-93
ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۲

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۲

رمضان - شوال ۱۴۱۳ھ / مارچ - اپریل ۱۹۹۳ء

شمارہ ۳، ۴

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

(اس شمارے کی قیمت 6 روپے)

سالانہ زر تعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا
اکیسواں سالانہ اجلاس

حسب پروگرام مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا اکیسواں سالانہ اجلاس جمعہ ۲ اپریل ۹۳ء کو قرآن آڈیٹوریم' اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے لئے حسب قواعد اجلاس سے پندرہ روز قبل تمام اراکین انجمن کو اجلاس کی اطلاع بذریعہ ڈاک روانہ کردی گئی تھی۔ اس اطلاع نامے کے ساتھ ہی مرکزی انجمن کی سالانہ رپورٹ بابت سال ۹۲ء بھی سپرد ڈاک کی گئی تھی۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ بہت سے اراکین تک وہ اطلاع نامہ پہنچ نہیں پایا جس کے باعث وہ اجلاس میں شرکت سے محروم رہے۔ گمان غالب ہے کہ عیدالفطر کے موقع پر عید کارڈز کے بے پناہ سیلاب کے باعث ڈاک کا نظام تلپٹ ہوگیا تھا اور اس کے باوجود کہ اطلاع نامہ اجلاس سے پندرہ بیس روز قبل سپرد ڈاک کردیا گیا تھا' بہت سے اراکین کو بروقت اجلاس کی اطلاع نہ ہوسکی' نتیجہ اس سالانہ اجلاس میں اراکین کی حاضری توقع سے بہت کم رہی۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق نماز مغرب سے قبل شرکاء کی چائے سے تواضع کی گئی' اجلاس کا باقاعدہ آغاز نماز مغرب کے بعد ہوا۔ پچھلے سال کی مانند اس سال بھی منسلک انجمنوں کے نمائندوں کو بھی مرکزی انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے اور اپنے اپنے علاقوں میں قائم منسلک انجمنوں کی کارکردگی کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی' چنانچہ کراچی' کوئٹہ' فیصل آباد اور پشاور میں قائم منسلک انجمنوں کے نمائندے بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ تلاوت قرآن حکیم کے بعد مرکزی انجمن کے معتمد جناب الطاف حسین صاحب نے گزشتہ سالانہ اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی اور شرکاء اجلاس سے اس کی توثیق حاصل کی۔ اس کے بعد مرکزی انجمن کے ناظم اعلیٰ جناب سراج الحق سید صاحب نے سال ۹۲ء کے دوران مرکزی انجمن کی کارکردگی کی ایک جامع رپورٹ پیش کی اور شائع شدہ رپورٹ کے چیدہ چیدہ حصے شرکاء اجلاس کو پڑھ کر سنائے۔ سید صاحب کے بعد ناظم بیت المال کی طرف سے جناب احسن الدین صاحب نے انجمن کے حسابات کا جائزہ پیش کیا اور اس ضمن میں شرکاء اجلاس کے سوالات کے جوابات دیئے۔ بعدازاں منسلک انجمنوں کے نمائندوں نے اپنی اپنی انجمنوں کی مختصر کارکردگی پیش کی۔ اس ضمن میں کوئٹہ سے جناب سید برہان علی صاحب' کراچی سے زین العابدین صاحب فیصل آباد سے جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور پشاور سے جناب

(باقی صفحہ ۷۳ پر)

امریکہ میں قرآن کے انقلابی فکر کا فروغ

ڈاکٹر اسرار احمد

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

امریکہ میں بلادِ عرب اور برِّعظیم پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے امیگرنٹ مسلمانوں کی نئی نسل میں "مسلم فنڈا مسٹلزم" ہی نہیں "اسلامک ریڈ کلزم" جس تیزی سے فروغ پارہا ہے اس کا جائزہ اور تجزیہ گذشتہ ہفتے پیش کیا جاچکا ہے جس کے باعث دشمنانِ اسلام بالخصوص امریکہ میں آباد یہودیوں اور اسرائیلی صیہونیوں کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ اب اس سے پہلے کہ اس وقت عالمی ملتِ اسلامیہ جس پریشان کُن صورت حال سے دوچار ہے اس کے اسباب و عِلَل کا تجزیہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں کیا جائے' اور مستقبل قریب میں ۔ "اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا - اور غمناک یہ تاریک اندھیرے ہوں گے!" والی کیفیت جس کے آثار مشرق و مغرب میں نمایاں ہورہے ہیں ان کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں کا جائزہ لیا جائے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس امر پر غور کیا جائے کہ ان حالات میں تبدیلی کیسے پیدا کی جاسکتی ہے اور اس پریشان کن صورت حال سے رستگاری کی سبیل کونسی ہے ------ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حالیہ سفرِ امریکہ کا ایک اجمالی واقعاتی جائزہ پیش کردیا جائے تاکہ قارئین کو اندازہ ہوسکے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں قرآن کے انقلابی فکر سے دلچسپی کس تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے جس کی بناء پر وہاں کے بعض لوگ تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ وہی خطۂ ارضی بنے گا --- اور احادیثِ نبویہؐ میں قربِ قیامت کی علامات میں سے ایک جو یہ بتائی گئی ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوگا شاید اسی کا عکس یہ بھی ہو اب اسلام کے عالمی غلبے کا سورج بھی بلادِ مغرب ہی سے طلوع ہو جس کا مصداقِ اَتم اِس وقت امریکہ ہے (واضح رہے کہ یہ وہاں کے کچھ لوگوں کا خیال ہے

جسے راقم نے نقل کردیا ہے۔ ورنہ خود راقم کا پختہ خیال یہی ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا سورج مشرق ہی سے طلوع ہوگا اور ان شاء اللہ پاکستان اور افغانستان پر مشتمل خطۂ ارضی ہی اس سلسلے میں فیصلہ کُن رول ادا کرے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے محل میں کرادی تھی اسی طرح اسلامی انقلاب کے لئے ایک پوری نسل کی تربیت وقت کے فرعونِ اعظم اور "نیو ورلڈ آرڈر" کی سربراہی کے زعم میں مبتلا ملک میں کرادے۔ واللہ اعلم!)

اس سے قبل اس امر کی وضاحت بھی ہوچکی ہے کہ اب سے لگ بھگ تین سال قبل راقم امریکہ میں آباد مسلمانوں کے حلقے میں سماجی اور تعلیمی کاموں یا کمیونٹی آرگنائزیشن سے بڑھ کر اقامتِ دین کی کسی منظم جدوجہد کے امکانات کے بارے میں مایوس ہوگیا تھا۔ اس پس منظر میں غور کیا جائے تو راقم کا حالیہ سفر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت ہی کا مظہر نظر آتا ہے اس لئے کہ یہ بالکل اچانک اور قطعاً غیر متوقع طور پر طے پایا۔ چنانچہ ۲۴ دسمبر ۹۲ء تک خود میرے یا کسی اور کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایسا کوئی پروگرام بننے والا ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ میں تنظیم اسلامی کے احباب و رفقاء کی جانب سے بھی نہ کوئی دعوت تھی' نہ خواہش کا اظہار! لیکن ۲۵ دسمبر کو کراچی میں ایک رفیق نے اپنے امریکہ میں آباد بعض اعزّہ کی جانب سے کچھ ایسے انداز میں دعوت پیش کی کہ میں اسے اپنی صحت اور جسمانی عوارض (بالخصوص گھٹنوں کی شدید تکلیف) اور بعض دوسرے مسائل و موانع کے باوجود رد نہ کرسکا۔ پھر جس تیزی کے ساتھ اس سفر کے جملہ معاملات طے ہوئے ان کی بھی اس سے قبل کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیّت تھی کہ وہ مجھے وہاں کے حالات کا از سرِنو مشاہدہ کراکے اپنی رائے پر نظرثانی کا موقع عنایت فرمائے! پھر وہاں قیام کا ارادہ بھی زیادہ سے زیادہ تین ہفتے کا تھا جو وہاں کے حالات کے تقاضے کے تحت بڑھ کر چار ہفتوں سے بھی بڑھ گیا۔ بہرحال ذیل میں اپنی امریکہ میں ۳۷ دنوں کی مصروفیات کا اجمالی نقشہ دے رہا ہوں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ وہاں قرآن کے اجتماعی اور عمرانی فکر اور اسلام کی انقلابی دعوت کو کس درجہ مقبولیت حاصل ہوچکی ہے۔

۵

نیوجرسی

اپنے سب سے چھوٹے صاحبزادے آصف حمید کے ہمراہ نیویارک کے جے ایف کے ایئرپورٹ پر جمعرات ۲۱ جنوری دن کے ڈھائی بجے کے لگ بھگ پہنچا ہوا' جہاں نیوجرسی کے میزبان حضرات یعنی جناب محمد حسین صاحب اور محمد ظہیر صاحب کے علاوہ تنظیم اسلامی کے رفقاء راحیل ملک اور ڈاکٹر منظور علی شیخ استقبال کے لئے موجود تھے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ صبح کو لاہور سے روانہ ہو کر اسی روز دوپہر کو نیویارک اس لئے پہنچ گئے کہ یہاں اور وہاں کے وقت میں قریباً دس گھنٹے کا فرق ہے' ورنہ سفر تو کوئی اٹھارہ گھنٹے کا طے کیا۔ بہرحال ایئرپورٹ سے کار کے ذریعے عشاء کے قریب نیوجرسی کے اہم صنعتی شہر ٹرینٹن (TRENTON) میں محمد حسین صاحب کی رہائش گاہ پہنچے جہاں قیام کا بندوبست تھا۔ نماز عصر اور مغرب راستے میں سنٹرل جرسی کے اسلامک سنٹر کی خوبصورت مسجد میں ادا کی گئیں۔

"ٹرینٹن" کی مسجد صفاء میں اگلے روز صبح کا درسِ قرآن طے تھا' لیکن اسے طویل سفر کے "جیٹ لیگ" (Jet Lag) کے باعث منسوخ کرنا پڑا۔ تاہم اسی مسجد میں جمعہ کا خطاب ہوا جس میں "ذلت و مسکنت ہم پر مسلط ہے یا یہودیوں پر؟" کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔

اس دوران شکاگو سے "فرینڈز آف تنظیم اسلامی پاکستان" (FOTIP) کے ناظم عطاء الرحمٰن صاحب بھی پہنچ گئے اور تین روز یعنی جمعہ' ہفتہ اور اتوار مقیم رہے۔ جمعہ کی شام قریباً دو گھنٹے کی مسافت پر واقع "مُورز ٹاؤن" (Moores Town) کے ٹاؤن ہال میں عشاء کی نماز کے بعد "مسلمانوں کا ماضی' حال اور مستقبل" کے موضوع پر دو گھنٹے تک انگریزی میں خطاب کرنے کے بعد واپس قیام گاہ پہنچے۔ ٹرینٹن میں قیام چھ روز رہا اور سوائے پہلے دن کے بقیہ پانچوں دن باقاعدگی سے مسجد صفاء میں صبح کا درس قرآن جاری رہا۔ یہ درس بھی انگریزی ہی میں ہوتا رہا اس لئے کہ اس مسجد کے نمازیوں میں معتدبہ تعداد مقامی افریقی' امریکی مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ صبح کے اس درس کے علاوہ ان پانچ دنوں میں نیوجرسی کے علاقے میں مختلف مقامات پر نہایت کامیاب اجتماعات منعقد ہوئے۔ چنانچہ:

۶

○ ہفتہ ۲۳ جنوری کا پروگرام خاصا بھاری رہا۔ نیوبرن وک (New Brunswick) کے شیرٹن ہوٹل میں ظہر کی نماز کے بعد ایک کانفرنس سے خطاب کا پروگرام تھا جو غیر معمولی طوالت اختیار کرگیا جس کے باعث مغرب کی نماز بھی وہیں ادا کرنا پڑی۔ واپسی پر ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے کرکے مسجد صفاء میں اجتماعی کھانے اور نماز عشاء کے بعد "مسلم اور مومن کا فرق" کے موضوع پر خطاب ہوا' جس میں افریقی' امریکی اور عرب مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

○ اتوار ۲۴ فروری کا پروگرام تو ناقابل قیاس حد تک بھاری رہا۔ چنانچہ سنٹرل جرسی اسلامک سوسائٹی کے مرکز میں صبح ۱۰ بجے "امت مسلمہ کی دوہری ذمہ داری" کے بارے میں خطاب تھا' لہٰذا ناشتے کے فوراً بعد ادھر روانہ ہوگئے۔ یہاں سامعین کی اکثریت عرب مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ (وہاں کے امام شبلی جو مصری عالم ہیں خطاب سے اس درجہ متأثر ہوئے کہ بعد میں باقاعدہ شد رحال کرکے ٹرینٹن کی مسجد صفا میں خطاب میں شرکت فرماتے رہے اور نوٹس لیتے رہے۔) وہاں سے بھاگم بھاگ بونسٹن (Boonston) اسلامک سنٹر پہنچے جہاں نمازِ ظہر کے بعد خطاب کا پروگرام تھا۔ اگرچہ مسلسل مشقت کی وجہ سے تھکاوٹ اور گلے کی خرابی جیسے مسائل درپیش تھے اور ساتھ ساتھ زود اثر لیکن انجام کار کے اعتبار سے کسی قدر مضر ادویات کا استعمال بھی ہو رہا تھا لیکن اللہ کی تائید و نصرت سے وہاں بھی بھرپور خطاب ہوا۔ نماز عصر کے بعد سفر کا اگلا مرحلہ شروع ہوا اور مغرب کی نماز "سمرول" (Somerville) پہنچ کر ادا کی۔ نماز کے بعد یہاں بھی مفصل خطاب ہوا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر واپسی کا سفر شروع ہوا اور اس طرح نصف شب کے قریب قیام گاہ پہنچنا ہوا۔

○ سوموار ۲۵ جنوری تا بدھ ۲۷ جنوری زیادہ تر پروگرام مسجد صفاء' ٹرینٹن میں ہوئے جن میں روزانہ بعد نمازِ عشاء ایک تقریر تو التزاماً ہوئی۔ مزید برآں ایک خصوصی پروگرام خواتین کے لئے بھی ہوا اور یہاں صرف یہی ایک تقریر اردو میں ہوئی' اس لئے کہ اس میں ہند و پاک سے تعلق رکھنے والی خواتین کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ساتھ ہی مقامی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے حضرات سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ نیویارک اور نیوجرسی میں "حزب التحریر" کے بعض سرکردہ حضرات کے ساتھ کوئی

ساڑھے تین گھنٹے تک مفید گفتگو رہی۔

۲۷ جنوری کو نیو جرسی سٹیٹ پرزن یعنی جیل میں مسلمان قیدیوں کو جن میں زیادہ تر سیاہ فام امریکن تھے' سورۃ العصر کا درس دیا گیا۔ رات نمازِ عشاء کے بعد یہاں آخری خطاب تھا' جس کے بعد جرسی سٹی کے لئے روانگی ہوئی۔ رات رفیق مکرم ڈاکٹر منظور علی شیخ کے ہاں قیام کیا اور ۲۱ر جنوری کو ورودِ امریکہ کے بعد صرف ۲۸ جنوری کے دن کسی قدر آرام کرنے کی فرصت نصیب ہوئی۔ نیو جرسی کے چھ روزہ قیام کے دوران نیویارک میں مقیم رفیقِ تنظیم جناب راحیل ملک بھی مسلسل راقم کے ساتھ ہی مقیم رہے اور حتی الامکان راقم کو آرام پہنچانے کا اہتمام کرتے رہے۔ یہ نوجوان کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

ڈیٹرائٹ

جمعرات ۲۸ جنوری کو شام ۶ بجے نیویارک کے "نیوارک ایئرپورٹ" سے روانہ ہوکر رات کے ساڑھے آٹھ بجے ڈیٹرائٹ پہنچنا ہوا' جہاں رفیقِ تنظیم جناب اعجاز چوہدری صاحب کے ہاں قیام رہا۔ یہ شہر شکاگو اور ٹورنٹو کے بالکل درمیان واقع ہے۔ (دونوں جانب فاصلہ تین سو میل کے لگ بھگ ہے) یہاں کا قیام اس سفر کا اہم ترین حصہ تھا' اس لئے کہ یہیں شکاگو اور ٹورنٹو کے رفقاء و احباب سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ تاکہ کچھ سابق غلط فہمیوں کے ازالے اور آئندہ کے لائحہ عمل پر گفتگو ہوسکے۔ چنانچہ بروز جمعہ نمازِ فجر کے بعد شکاگو کے رفقاء کے ساتھ ملاقات ہوئی اور سہ پہر کو "فونِپ" کے رفقاء سے تبادلۂ خیال رہا۔ اس کے علاوہ "ٹرائے" کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ بھی دیا اور بعد نمازِ عشاء "امتِ مسلمہ کی موجودہ حالتِ زار" کے موضوع پر خطاب بھی کیا۔

ہفتہ ۳۰ جنوری کو حسبِ پروگرام شکاگو کے ڈاکٹر خورشید صاحب اور ڈاکٹر طور صاحب سمیت ٹورنٹو' ڈیٹرائٹ اور شکاگو کے دیگر پرانے اور نئے رفقاء کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ مزید برآں "ٹرائے" کی مسجد میں کل رات کے موضوع کے دوسرے حصہ پر خطاب ہوا۔ رفقاء کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ اگلے روز ۳۱ جنوری کو بھی جاری رہا اور چونکہ بحمداللہ بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا لہٰذا آخر میں ڈاکٹر انصاری صاحب کو "ٹینا" یعنی تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کو نئے سرے سے منظم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

سینٹ لوئیس

یکم تا ۳ فروری سینٹ لوئیس (مزوری) میں قیام رہا۔ یہاں کا پروگرام اصل میں تو ڈاکٹر وقاصی صاحب سے اپنے طبی معائنے' بالخصوص قلب کے مشہور Stress Test کے لئے رکھا تھا۔ اس لئے کہ دو سال قبل کی ایک Visit کے دوران یہاں ڈاکٹر وقاصی صاحب ہی کے کلینک میں یہ Test ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں بلڈ پریشر کے رجحان کی تشخیص ہوئی تھی اور ان ہی کی تجویز کردہ دوا دو سال سے زیر استعمال تھی۔ الحمدللہ کہ یہ Test باقی ہر طرح سے تسلی بخش رہا۔ اور میں جو جملہ از راہِ تفنن کہا کرتا ہوں وہ صحیح ہی ثابت ہوا۔ یعنی یہ کہ "میرے دماغ میں تو کوئی خرابی ہوسکتی ہے' بحمداللہ دل میں کوئی خرابی نہیں ہے۔" ڈاکٹر وقاصی پاکستان کے صوبہ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں اور دو سال قبل کی ملاقات میں میں ان کی اور ایک دوسرے سندھی سرجن ڈاکٹر قاضی صاحب کی شرافت و نجابت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ سینٹ لوئیس میں قیام لاہور سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ٹیپو سلطان صاحب کے مکان پر رہا۔ وہ "الرجی" کے سپیشلسٹ ہیں۔ انہوں نے بھی خون کا تفصیلی تجزیہ اور معائنہ کیا اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر و ثواب عطا فرمائے۔

تین فروری کو سینٹ لوئیس کے اسلامک سنٹر میں مفصل خطاب ہوا۔ (یہ اگرچہ Working Day تھا جس میں امریکہ میں کسی اجتماع یا فنکشن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن حاضری بحمداللہ حیران کن تھی۔ پورا ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا اور صرف محاورہ کے طور پر نہیں بطورِ واقعہ "تِل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تھی!")

سپرنگ فیلڈ

۳ فروری کو "گریٹر سپرنگ فیلڈ" کی اسلامک سوسائٹی کے زیر اہتمام مفصل خطاب ہوا۔ یہ شہر سینٹ لوئیس سے تقریباً سوا سو میل کے فاصلے پر ہے' چنانچہ بذریعہ کار آنا جانا ہوا۔ یہاں جانا اس لئے ضروری تھا کہ اس مقام پر محترم عطاء الرحمٰن صاحب کے حقیقی بھائیوں کے علاوہ بعض دوسرے اعزّہ بھی قیام پذیر ہیں۔

ویسٹ ورجینیا

۴ر تا ۷ فروری کا Week End ویسٹ ورجینیا کے علاقے میں بسر ہوا۔ یہاں

میری آمد تو پہلی بار ہورہی تھی لیکن اس سے قبل تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کے بعض رفقاء یہاں کا ایک دعوتی دورہ کرچکے تھے اور اسی بناء پر وہاں کے احباب کی جانب سے میری آمد کے لئے شدید خواہش اور پرزور دعوت تھی۔ (بلکہ اس مرتبہ کے اخراجاتِ سفر میں سے نصف نیوجرسی کے احباب نے اور بقیہ نصف ویسٹ ورجینیا کے احباب ہی نے برداشت کئے۔)

یہ علاقہ پاکستان کے ضلع ہزارہ سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور یہاں پہاڑی سلسلوں کے مابین چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہیں۔ جہاں کا ماحول امریکہ کے بڑے شہروں کے شور و شغب اور ہنگاموں سے بہت مختلف اور نہایت پرسکون ہے۔ چنانچہ بلیوفیلڈ شہر جس کے مضافات میں ڈاکٹر ریاض الدین صاحب کے مکان پر ہمارا قیام رہا' اگرچہ خاصا بڑا ہے لیکن اس کا کوئی ایئرپورٹ نہیں ہے۔ اور قریب ترین ہوائی اڈے جو وہاں سے سو سوا سو میل کے فاصلے پر ہیں وہاں بھی صرف چھوٹے جہازوں ہی کی آمدورفت ہے۔ یہاں اگرچہ کوئی زیادہ بڑا اجتماع تو منعقد نہیں ہوا۔ تاہم ڈاکٹر ریاض الدین صاحب کے علاوہ جن کا تعلق حیدرآباد (دکن) سے ہے پاکستان سے تعلق رکھنے والے جن بعض سینئر ڈاکٹر حضرات سے وہاں تعارف ہوا ہے ان کے جوش اور جذبے سے امید ہوتی ہے کہ شاید وہ علاقہ امریکہ میں دعوتِ قرآنی کا بڑا مرکز بن جائے۔ (**وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیز**) ان میں سے بعض حضرات سے راقم کو خصوصی دلچسپی اس بناء پر ہوئی کہ ان کی عزیز داری چوہدری نیاز علی خاں مرحوم' بانی ادارہ دارالاسلام' پٹھان کوٹ' سے ہے۔

یہاں میری آمد کے ساتھ ہی شکاگو سے رفقاءِ تنظیم کا ایک قافلہ بھی بارہ گھنٹے کا سفر بذریعہ کار کرکے پہنچ گیا جس میں عطاء الرحمٰن صاحب کے علاوہ جناب اورنگ زیب' جناب غلام سبحانی بلوچ اور جناب عظمت تنویر شامل تھے۔ یہاں تین دنوں میں پانچ خطاب ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے:

○ جمعہ ۵ر فروری کو بعد نمازِ جمعہ ورجینیا ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ' بلیکس برگ میں مختصر خطاب ہوا۔

○ ۵ر اور ۶ر فروری کو بعد نمازِ عشاء ڈاکٹر نعیم قاضی صاحب کے مکان پر تعارف قرآن حکیم اور مطالعۂ قرآن کے اصول کے موضوع پر تقاریر ہوئیں۔

○ ۶ ر فروری ہی کو ورجینیا ٹیکنیکل یونیورسٹی ہی کے "مک برج ہال" میں قرآن اور امنِ عالم کے موضوع پر خطاب ہوا۔

○ آخری خطاب اتوار ۷ ر فروری کی صبح کو بلیو فیلڈ یوتھ سنٹر کے ہال میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے موضوع پر ہوا۔

یہاں بھی حزب التحریر سے متعلق بعض نوجوانوں سے بہت مفید گفتگو رہی۔ ان میں سے دو عرب نوجوان جوش اور جذبے کے ساتھ سنجیدگی اور متانت ہی نہیں فکر و فہم کی گہرائی کا نہایت حسین امتزاج نظر آئے۔ اور حسن اتفاق سے دونوں ہی کا نام "اسامہ" ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ!

بفلو

۸ ر اور ۹ فروری بفلو میں بسر ہوئے۔ وہاں کے میزبان ڈاکٹر سید ساجد حسین تھے جو ۱۹۷۹ء میں پہلے سفرِ امریکہ میں میرے اولین میزبان رہے تھے۔ اس کے بعد سے ان سے کوئی خاص رابطہ نہیں رہا تھا۔ تاہم پچھلے دنوں اپنی پاکستان آمد پر انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ اب جب بھی امریکہ آنا ہو ایک دو روز کے لئے ان کے پاس بھی ضرور آؤں گا۔ وہاں میرا اصل خیال "آرام" کا تھا۔ اضافی خیال یہ بھی تھا کہ ٹورنٹو کے جو رفقاء ڈیٹرائٹ نہ آسکیں گے ان کے لئے بفلو آکر ملاقات کرنے میں سہولت رہے گی۔ اس لئے کہ وہاں سے ٹورنٹو کا فاصلہ صرف ایک سو میل ہے۔ ایک اور خواہش یہ بھی تھی کہ مولانا مودودی مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے ملاقات کی تجدید ہوجائے (یادش بخیر' ان سے پہلی ملاقات ۷۹ء میں مولانا مرحوم کے انتقال کے موقع پر ہوئی تھی' اور پھر ۸۰ء' ۸۱ء اور ۸۲ء میں بھی مسلسل ملاقاتیں رہی تھیں) ---- الحمد للہ کہ میری ان تمام خواہشوں کی اللہ تعالیٰ نے بھرپور تکمیل کرادی۔ چنانچہ ٹورنٹو سے نہ صرف رفیقِ تنظیم چوہدری عبدالغفور صاحب مع اپنی اہلیہ کے (یہ بھی تنظیم کی سرگرم کارکن ہیں) تشریف لائے بلکہ "نَافِلَةً لَّکَ" کے طور پر جناب سعید الظفر صاحب بھی ایک نہایت پرجوش سوڈانی مسلم "فنڈا منٹلسٹ" اور Activist کے ہمراہ تشریف لائے جن سے مفصل ملاقاتیں اور گفتگوئیں رہیں۔ اسی طرح بحمد اللہ کہ ڈاکٹر احمد فاروق بھی دو مرتبہ ڈاکٹر ساجد حسین صاحب کے مکان پر تشریف لائے اور ان سے بھی مفصل گفتگو رہی۔

بالکل اضافی طور پر .بفلو کے اسلامک سنٹر میں بھی بعد نمازِ عشاء ایک خطاب عام ہوا۔ یہ بھی چونکہ Working Days تھے لہٰذا حاضری کی کم ہی توقع تھی' لیکن یہاں بھی بالکل سینٹ لوئیس والی حیرت کا سامنا ہوا۔ ایک کثیر تعداد میں لوگوں نے خاصی طویل تقریر کو پوری توجہ اور ذوق و شوق کے ساتھ سنا۔ یہاں "وادیٔ کشمیر" سے تعلق رکھنے والے سینئر ڈاکٹر حضرات کے ایک گروپ سے ملاقات ہوئی۔ جن میں سے ایک سے تو دیرینہ شناسائی تھی یعنی ڈاکٹر نعیم قاضی سے' جو اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے صدر رہے ہیں۔ (انہوں نے میرا ذوق بھانپ کر نمکین کشمیری چائے کی سپلائی کا تسلسل برقرار رکھا) باقی حضرات سے یہ پہلی ہی ملاقات تھی۔ جو کیا عجب کہ کسی مستقل تعلق کی تمہید بن جائے۔

نیویارک

حالیہ سفر کے نتیجے میں سب سے زیادہ پیش رفت نیویارک میں ہوئی۔ اس سفر سے قبل کے تیرہ سالوں کے دوران امریکہ کے "شاہ درہ" ہونے کے ناطے نیویارک میں آتے جاتے کچھ ملاقاتیں اور بھاگتے دوڑتے بعض خطابات بھی ہوجاتے تھے لیکن تنظیم یا انجمن کی کوئی بنیاد وہاں قائم نہیں ہوسکی تھی۔ وہاں قیام ہمیشہ برادرم الطاف احمد صاحب کے مکان پر رہا (یہ تنظیم میں شامل تو ہوگئے تھے لیکن فعال نہیں ہوسکے) اور خطابات اکثر و بیشتر مسلم سنٹر آف نیویارک واقع فلشنگ میں ہوتے رہے۔ ملاقاتوں میں جماعتِ اسلامی سے بہت قدیمی تعلق رکھنے والے جناب شمیم صدیقی اور ان ہی کے نہایت قریبی دوست اور رفیقِ کار جناب شمشیر علی بیگ سرِفہرست رہے۔ یہ حضرات جماعت کی موجودہ پالیسی اور بالخصوص امریکہ میں "اِکنا" کی سرگرمیوں سے غیر مطمئن ہوکر اپنے طور پر امریکہ میں اقامتِ دین کی تحریک کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

اس بار میں ابھی نیوجرسی ہی میں مقیم تھا کہ یہ دونوں حضرات مذکورہ بالا مسلم سنٹر کے صدر شیخ نوید انور اور بعض دیگر رفقاء کے ہمراہ (گویا پوری Force کے ساتھ) وہاں تشریف لائے اور نیویارک آنے کی پرزور دعوت کے ساتھ ایک لمبا چوڑا پروگرام بھی پیش کردیا۔ جس پر میں نے حتمی وعدہ تو نہیں کیا البتہ کوشش کرنے کی حد تک امید دلادی۔ تاہم یہ کسی کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ نیویارک میں اتنے کامیاب

پروگرام ہو سکیں گے۔

بفلو سے راقم ۱۰ر فروری کی رات کو نیوارک ایئرپورٹ پر پہنچا اور رات جرسی سٹی میں ڈاکٹر منظور علی شیخ کے مکان پر قیام کیا۔ اگلا دن اپنی واپسی کی بکنگ وغیرہ کے اہتمام میں گزرا۔ ۱۱ر فروری کی رات سے ۱۵ر فروری کی صبح تک قیام لانگ آئی لینڈ میں واقع شیخ نوید انور صاحب کے "محل نما مکان" میں رہا۔ جنہوں نے مجھے آرام پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہونے دیا۔

۱۲ فروری کو نماز اور خطاب جمعہ "مین ہٹن" میں سٹی ہال کے قریب وارن سٹریٹ کی جامع مسجد میں تھا۔ اس روز "لنکنز ڈے" کے موقع پر عام تعطیل تھی اور شدید برف باری ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود مسجد کا وسیع ہال حاضرین سے پر ہو چکا تھا۔ وہاں میں نے "مسلمانوں کا مستقبل اور ہماری ذمہ داری" کے حوالے سے خطاب کیا۔ اسی رات "فلشنگ" کے مسلم سنٹر میں دو گھنٹے کا مفصل خطاب ہوا۔ جہاں ہال جلد ہی کھچا کھچ بھر گیا جس کے بعد خاصی بڑی تعداد میں لوگوں کو جگہ نہ ملنے کے سبب مایوس لوٹنا پڑا۔ ۱۳ فروری کو مقامی ائمۂ مساجد اور دینی رہنماؤں سے ملاقات کا پروگرام طے تھا مگر مسلسل برف باری اور خراب موسم کی وجہ سے حاضری توقع سے کم رہی۔ یہ پروگرام ظہر تک جاری رہا۔ عصر کی نماز "مسجد فاطمہ" Queens میں ادا کی گئی جہاں "حزب التحریر" کی جانب سے ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے "حزب التحریر" کے جناب ابوعاصی ندال صاحب نے اسلامی انقلاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مغرب کی نماز کے بعد میں نے وضاحت کے ساتھ سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں اسلامی انقلاب کا منہج پیش کیا۔ بعد ازاں ہم دونوں نے حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے اور یوں عشاء کی نماز کے بعد یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

۱۴ فروری صبح ۱۰ بجے "ویسٹ میری لانگ آئی لینڈ اسلامک سنٹر" میں خطاب کا عنوان تھا: "جہاد اور اس کے مراحل"۔ کم و بیش دو گھنٹوں پر محیط اس خطاب کو حاضرین نے نہایت سکون اور دلچسپی سے سنا۔ اسی رات یہاں آخری خطاب "اسلامک سنٹر فلشنگ" میں ہوا جہاں اس سے قبل جمعہ کے روز ایک خطاب ہو چکا تھا۔ خطاب کے بعد سوال' جواب کی نشست ہوئی۔ حاضرین کی تعداد برف کے طوفان کے باوجود پہلے سے بھی

زیادہ تھی' اور جوش خروش دیدنی تھا۔ رات ڈاکٹر منظور شیخ صاحب کے ہاں قیام کیا جہاں سے اگلے روز علی الصبح نیورک ایئرپورٹ سے "ہوسٹن" کے لئے روانگی ہوئی۔

ہوسٹن

میرے اپنے پروگرام کے مطابق تو چودہ فروری کے لگ بھگ امریکہ سے واپسی طے تھی۔ لیکن بعض اسباب کے باعث امریکہ کا یہ سفر بارہ روز مزید طویل ہوگیا۔

اس کا پہلا سبب ہوسٹن میں مقیم رفیقِ تنظیم اعجازالحق صاحب کا اصرار تھا کہ خواہ ایک ہی روز کے لئے آنا ہو ہوسٹن ضرور آئیں۔ میں نے ان پر شرط عائد کردی تھی کہ اگر ڈیٹرائٹ کے اجتماع میں شرکت کریں گے تو غور کروں گا۔ وہ وہاں نہ صرف خود بلکہ ایک اور دوست میر باسط صاحب کے ساتھ تشریف لے آئے۔ چنانچہ ۱۵ اور ۱۶ فروری کے دو دن ہوسٹن میں صرف ہوئے۔ اور وہاں اس پورے سفر کا سب سے بڑا Surprise سامنے آیا۔ یعنی ۱۵ فروری کو بعد نمازِ عشاء نارتھ ویسٹ زون کی مسجد سے ملحق ہال میں جو اجتماع ہوا اس میں ایک ہزار کے لگ بھگ خواتین و حضرات شریک ہوئے اور ہال اپنی وسعت کے باوجود تنگ پڑ گیا۔ حالانکہ یہ بھی "کام کا دن" تھا ---- اور وہ بھی سوموار! اجتماع کے بعد وہاں کی نمایاں سماجی اور دینی شخصیت ڈاکٹر نثار احمد صاحب نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا: "خدارا! اپنے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس انگریزی میں بھی ریکارڈ کرادیں ---- اس کے جملہ انتظامات اور اخراجات کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں!!"

۱۶ر فروری کو ہوسٹن کے مرکزی اسلامک سنٹر میں صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ اجتماع ہوا جس میں ہوسٹن کے مختلف علاقوں کی مساجد کے ائمہ حضرات خصوصیت کے ساتھ تشریف لائے۔ اسی دوپہر کو ساؤتھ زون کی مسجد میں خواتین کے ایک خصوصی اجتماع سے "اسلام میں خواتین کا مقام اور حقوق" کے موضوع پر مختصر خطاب ہوا۔ اور پھر رات کو آخری پروگرام اعجازالحق صاحب کے مکان پر ہوا جس میں Dinner کے بعد "فرائضِ دینی" کے موضوع پر اردو میں خطاب ہوا۔ جس کے نتیجے میں متعدد حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی۔

لاس اینجلس

۱۷ تا ۲۰ فروری لاس اینجلس میں پروگرام تھے جہاں میزبانی کے فرائض جناب محمد علی چوہدری نے سرانجام دیئے۔ ۱۷ فروری کی شام کو چوہدری صاحب ہی کے مکان پر اورنج کاؤنٹی کی مسجد کے تنازعے کے بارے میں بعض اہم حضرات کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوا۔ جمعرات ۱۸ فروری کو صبح ۱۱ بجے "وال نٹ" کے اسلامی تعلیمات کے مرکز میں "اسلام میں عورت کا مقام اور اس کی ذمہ داریاں" کے موضوع پر خطاب ہوا جس کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ ۱۸ تاریخ کو ہی شام ساڑھے چھ بجے "سان گبریل ویلی اسلامک سنٹر" میں "امتِ مسلمہ کا عروج و زوال اور سابقہ امت کے ساتھ اس کی مشابہت" کے حوالے سے مفصل خطاب ہوا۔ تین سو کے قریب خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ چونکہ پیشِ نظر گفتگو وضاحت کے ساتھ سامنے آچکی تھی اور دیر بھی خاصی ہو چکی تھی' نیز موسم بھی اچھا نہیں تھا۔ اس لئے سوال و جواب کی نشست ضروری نہیں سمجھی گئی۔ البتہ "حزب التحریر" کے ایک اہم رہنمانے خصوصی طور پر اجازت لیکر ایک سوال پیش کیا اور وہ یہ تھا کہ "ڈاکٹر صاحب! آپ کو ہم کس طرح مستقل طور پر اپنے ہاں لاسکتے ہیں؟"

جمعہ ۱۹ فروری ڈاکٹر مزمل صدیقی صاحب اور ڈاکٹر مجید صاحب کے ساتھ "گارڈن گرو" مسجد میں بڑی مفصل اور بامقصد گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد خطبۂ جمعہ کے دوران نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ امتِ مسلمہ کے اتحاد اور یکجہتی' احیاءِ دین اور نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد کی ضرورت و اہمیت بیان کی گئی' ڈیڑھ ہزار سے زائد افراد نے یہ خطبہ سنا۔ اسی رات کو "سڈل بیک ویلی" کے اسلامک سنٹر میں پروگرام تھا جو نمازِ عشاء اور رات کے کھانے کے بعد قریباً ۹ بجے شروع ہوا اور دو گھنٹے جاری رہا۔ اڑھائی سو کے قریب سامعین نے شرکت کی۔ میں نے جمعرات کی اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے منہجِ انقلابِ نبویؐ کے چھ مراحل کی وضاحت کی۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ سامعین میں نمایاں تعداد عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمان بھائیوں کی تھی جن میں سے بعض حضرات کم و بیش ستر پچھتر میل کا فاصلہ طے کرکے صرف اس پروگرام میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔

ہفتہ ۲۰ فروری صبح ۹ بجے نوجوان مسلمانوں کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا جو سوال و جواب پر مبنی تھی۔ یہ پروگرام ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہا۔ الحمدللہ مستقبل کی نوجوان قیادت کے ساتھ یہ بات چیت نہایت بامقصد رہی اور امید ہے ان شاء اللہ اس سے مفید نتائج بر آمد ہوں گے۔

شکاگو

لاس اینجلس سے ۲۰ فروری کی رات کو شکاگو پہنچنا ہوا۔ جہاں میزبانی کا "قرعۂ فال" تنظیم کے جواں سال رفیق تنویر عظمت صاحب کے نام نکلا۔ شکاگو میں اتوار ۲۱ر فروری کو دن کے گیارہ بجے "مسلم سوسائٹی آف گلینڈل ہائٹس" کے مرکز میں "امتِ مسلمہ کے موجودہ انتشار کا اصل علاج: قرآن حکیم" کے موضوع پر مفصل خطاب ہوا جس میں کثیر تعداد میں مردوں اور عورتوں نے شرکت کی۔ اسی شام ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کے مکان پر شکاگو کی انجمن خدام القرآن (S.S.Q) کے ذمہ دار رفقاء اور بعض دیگر اہم حضرات کے ساتھ کھانا کھایا اور گفتگو کی۔

۲۲ر فروری کو صبح تنویر عظمت صاحب کے مکان ہی پر "حزب التحریر" کے بعض اہم کارکن اور قائد حضرات تشریف لائے جن سے مفصل تبادلۂ خیال ہوا۔ (انہوں نے عرب ممالک کی اطلاع پر روزہ رکھا ہوا تھا) اسی رات کو گلینڈل ہائٹس کے مرکز میں نماز تراویح میں بھی شرکت ہوئی اور اس کے بعد "منہجِ انقلابِ نبوی" کے موضوع پر مفصل خطاب ہوا۔ اور سوال جواب کی نشست بھی منعقد ہوئی۔

دوبارہ ڈیٹرائٹ

ڈیٹرائٹ کے پہلے قیام (۲۹ر تا ۳۱ جنوری) کے دوران میری مصروفیت بہت شدید رہی تھی۔ محترم ڈاکٹر مظفر خان اعوان کی خواہش تھی کہ کسی طرح وقت نکال کر دوبارہ ڈیٹرائٹ آؤں تو میرے گھٹنے کی تکلیف کے ضمن میں کچھ تشخیص و تجویز کے مراحل طے ہوسکیں۔ چنانچہ ۲۳ر فروری کی شام کو پہلا روزہ شکاگو ایئرپورٹ پر افطار کرکے دوبارہ ڈیٹرائٹ روانگی ہوئی۔ اور اس بار قیام بھی ڈاکٹر اعوان صاحب کے مکان پر رہا۔ ۲۴ر فروری کو گھٹنے کے "MRI" کے صبر آزما مرحلے سے گزر کر' ----- جناب ڈاکٹر انصاری اور

رشید لودھی صاحبان سے امریکہ میں تنظیمِ اسلامی کی تنظیمِ نو کے ضمن میں مشورے کرنے کے بعد اسی رات کو نیویارک واپسی ہوگئی۔

دوبارہ نیویارک

۲۴ر اور ۲۵ر فروری کی درمیانی شب میں نے محمد اسرار خاں صاحب کے مکان واقع "پیرین ول" نیو جرسی میں بسر کی۔ یہ نوجوان میرے کیسٹوں کے حافظ ہونے کے ساتھ ہم نام ہونے اور ان سب پر مستزاد میری جائے پیدائش حصار ہی سے متعلق ہونے کی بناء پر شدید خواہشمند تھے کہ کم از کم ایک رات ضرور ان کے مکان پر بسر کروں۔ ان کے ذوق و شوق کو کئی امتحانات کے مراحل سے گزارنے کے بعد میں نے ان کی خواہش کی تکمیل کردی' اگرچہ اس کے لئے دو گھنٹے کی مسافت کار پر طے کرنی پڑی۔ دوسرے دن یعنی ۲۵ر فروری ان ہی کے ہمراہ مین ہٹن (Manhattan) میں واقع شیخ نوید انور صاحب کے کاروباری مرکز میں اور شام کو ان کے ساتھ ان کے مکان پر آنا ہوا جہاں دعوتِ افطار و طعام کا اہتمام بھی تھا ------ اور ایک "فیصلہ کُن گفتگو" کا پروگرام بھی۔ جس کے نتیجے میں بعض حضرات نے تو اسی وقت تنظیم میں شمولیت کا اعلان کردیا اور بعض نے اگلے روز یہ مرحلہ طے کرلیا۔

جمعہ ۲۶ر فروری کو خطاب جمعہ میڈیسن ایونیو کی جامع مسجد میں "روزہ کی حکمت و اہمیت" کے موضوع پر دیا۔ واضح رہے کہ عین اسی وقت اور وہاں سے بہت قریب ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بم کا وہ دھماکہ ہوا تھا جس کی خبریں پوری دنیا میں سنی گئیں اور جو امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے اعتبار سے بہت دور رس نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔

نماز جمعہ کے بعد مسجد کے قریب ہی واقع جناب ابراہیم لونت صاحب کے دفتر میں ایک مختصر نشست ہوئی جو رات کی "فیصلہ کن گفتگو" کا تکملہ تھی چنانچہ اس موقع پر شیخ نوید انور اور جناب ابراہیم لونت سمیت پانچ حضرات نے مسنون بیعت کے مرحلے سے گزر کر تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ جن میں سے ایک یعنی جناب ممنون احمد مرغوب میرے قریبی عزیزوں میں سے ہیں۔ دوسرے عارف ضیاء صاحب ممنون صاحب کے رشتے کے نواسے اور پاکستان کے مشہور و معروف صحافی ضیاء الاسلام انصاری مرحوم کے فرزند ہیں۔ (محمد اسرار خاں اس اجتماع میں شرکت نہیں کرسکے تھے لیکن انہوں نے بھی

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

مطالعہ قرآن حکیم

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۃ الانفال

آیات ۱۵۔۔۔۱۶

اَحْمَدُهٗ وَاُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ۝

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ

الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا

اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶

صدق اللہ العظیم

"اے ایمان والو! جب کبھی کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ باقاعدہ فوج کشی کی صورت میں ہو تو ہرگز انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور جو کوئی اُن کو پیٹھ دکھائے گا، سوائے اس کے کہ جنگی چال کے طور پر پینترا بدلنا مقصود ہو یا کسی دوسرے گروہ سے جا ملنا مطلوب ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے گا اور اس کا ٹھکانا جہنّم ہوگا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو قتال فی سبیل اللہ کے موقع پر کفّار کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کا تاکیدی حکم بھی ہوا ہے اور اس کی خلاف ورزی پر شدید سزا کی وعید بھی وارد ہوئی ہے۔

واضح رہنا چاہیے کہ اسلام صرف عام معنوں میں ایک مذہب ہی نہیں ہے جو صرف دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت یا تزکیہ و تربیت پر اکتفا کرتا ہو بلکہ وہ ایک مکمل دین ہے جو پوری انسانی زندگی کو بجملہ انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں سمیت اپنے حیطۂ اقتدار میں لینا چاہتا ہے۔ اور یہ وہ مقصد ہے جس کے حصول کے لیے جلد یا بدیر باطل کی قوتوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہوتا ہے اور بالآخر مسلح تصادم کی نوبت

بھی آکر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم جہاد یعنی باطل سے کشمکش کو تو ایمان کا عین لازمی اور ناگزیر نتیجہ قرار دیتا ہے بفحوائے الفاظ قرآنی:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرات: ۱۵)

"حقیقی مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں بایں طور کہ شک باقی نہ رہے اور جہاد کریں اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سمیت۔ بس یہی لوگ سچے ہیں!"

رہا قتال فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جانا تو قرآن کی رُو سے یہ اسلام کے نظامِ حکمت و اخلاق میں بلند ترین نیکی یعنی "SUMMUM BONUM" یا خیرِ اعلیٰ یعنی "HIGHEST VIRTUE" ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (الصّف: ۴)

"اللہ تو محبوب رکھتا ہے انہیں جو اس کی راہ میں جنگ کریں ایسے صف بستہ ہو کر گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"

آیاتِ زیرِ درس میں یہی بات منفی اسلوب میں ادا کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ جان بچانے کی خاطر میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ایسے شخص کو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں جان و مال زیادہ عزیز ہیں اور آخرت کے مقابلے میں دنیا محبوب تر ہے۔ گویا ایمان کا دعویٰ صرف زبانی اقرار تک محدود ہے، دل نورِ ایمان سے خالی اور دولتِ یقین سے محروم ہے۔ لہٰذا ایسا شخص عذابِ خداوندی کا مستحق ہے اور اس کا اصل مقام جہنم ہے۔ جو بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے!!

آیاتِ زیرِ درس قرآنِ حکیم کی فصاحت و بلاغت اور ایجاز و اختصار کی ایک نہایت اعلیٰ اور درخشاں مثال ہیں، اس لیے کہ چند گنے چُنے الفاظ میں جہاں وعید کا پہلو پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہو گیا ہے، وہاں استثنار کی جملہ صورتوں کا بھی حد درجہ جامعیت کے ساتھ احاطہ ہو گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلا قابلِ توجہ لفظ "زحف" ہے جس کے لغوی معنی پاؤں گھسیٹ کر آہستہ آہستہ چلنے کے ہیں، جیسے وہ شخص چلتا ہے جس پر بہت بوجھ لدا ہوا ہو۔ اس سے یہاں مراد باقاعدہ فوج کشی ہے جس سے

حکم وعید صرف باقاعدہ فوج کشی کی صورت سے متعلق رہ گیا اور چھاپہ مار دستوں کا معاملہ اس سے خود بخود خارج ہو گیا۔ اس لیے کہ باقاعدہ فوج کشی' اور چھاپہ مار جنگ کے مابین فرق و تفاوت زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ چھاپہ مار جنگ کا تو اصول ہی یہ ہے کہ غنیم پر اچانک حملہ کیا جائے اور اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پسپائی اختیار کر لی جائے اس سے پہلے پہلے کہ وہ سنبھل کر جوابی وار کر سکے۔ دورِ جدید میں کمانڈوز کا طریق جنگ اور گوریلا WARFARE اسی کی ارتقاء یافتہ و منظم اور پوری دنیا میں مسلّم صورتیں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس طریق جنگ میں تو حملہ کے بعد فوری پسپائی اس کے عین مزاج اور بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ صورت آیاتِ زیرِ درس میں وارد شدہ وعید سے مستثنیٰ ہے۔ باقاعدہ فوج کشی کے لیے "زحف" کے لفظ کا استعمال بھی فصاحت و بلاغت کی معراج ہے' اس لیے کہ چھاپہ مار دستے اپنے مفوضہ فرائض کی مناسبت سے ہلکے پھلکے سامان سے لیس ہوتے ہیں تاکہ اُن کی تیزی سے حرکت کرنے کی صلاحیت یعنی MOBILITY برقرار رہے اور اس میں بوجھل سامان رکاوٹ نہ بنے۔ جبکہ باقاعدہ فوج جب حرکت کرتی ہے تو پورے سازوسامان کے ساتھ اور رسد وغیرہ کے پورے بندوبست کے ساتھ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رفتار سُست ہوتی ہے' اور یہی لفظ "زحف" کا اصل مفہوم ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حیاتِ نبویؐ کے دوران پہلی باقاعدہ جنگ میدانِ بدر میں ہوئی۔ اس سے قبل آنحضورؐ چھاپہ مار دستے روانہ فرماتے رہے تھے' جن کا مقصد قریش کے تجارتی راستوں کو مخدوش بنانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ وعید پہلے نازل نہیں ہوئی' بلکہ غزوۂ بدر کے موقع پر نازل ہوئی۔

باقاعدہ فوج کشی اور باضابطہ جنگ کی صورت میں بھی دو قسم کی پسپائیوں کو اس مقام پر وارد شدہ وعید سے مستثنیٰ کر دیا گیا یعنی وہ پسپائی جو مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ ہو یا مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ ـــــ 'حرف' کہتے ہیں ایک کنارے' ایک جانب یا ایک پہلو کو ـــ گویا 'متحرّف' وہ شخص ہے جو ایک طرف یا ایک کنارے کی جانب ہو جائے۔ اور اس میں مکمل تصویر ہے اس شخص کی جو کسی دُو بدُو مقابلے میں دشمن کے وار کو خالی کر دینے کے لیے پینترا بدل کر ایک جانب کو ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں کبھی بالکل گھوم جانا بھی ہو سکتا ہے اور اُس کے دوران ایک بار پیٹھ بھی غنیم کی جانب ہو سکتی ہے لیکن اس میں اصل مقصد گھوم کر وار کرنا اور مقابلہ جاری رکھنا ہوتا ہے نہ کہ جان بچا کر بھاگ

جانا جسے محاورہ میں پیٹھ دکھانا کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کبھی پوری فوج کی نقل و حرکت بھی کسی فوری جنگی چال کے پیشِ نظر ایسی نوعیت کی ہو سکتی ہے کہ جو بظاہر پسپائی بلکہ فرار نظر آئے۔ لیکن اگر یہ پسپائی پورے نظم و ضبط کے ساتھ سپہ سالار کے فرمان کے مطابق اور جنگ جاری رکھنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ ہو اور اس میں جان بچا کر بھاگ جانا پیشِ نظر نہ ہو تو فطری طور پر یہ صورت بھی متذکرہ وعید سے مستثنیٰ ہو گی۔ اسی طرح "حوز" کا مادہ عربی زبان میں کسی چیز کے کسی دوسری چیز کے ساتھ جا ملنے اور جڑ جانے کے لیے آتا ہے۔ گویا "مُتَحَیِّزٌ" وہ شخص یا گروہ ہے جو کسی اور شخص یا گروہ کے ساتھ جا کر مل جائے۔ باقاعدہ جنگ کی صورت میں اس کا اطلاق اس پر ہو گا کہ اگر دشمن کی طاقت ہر نسبت و تناسب سے متجاوز ہو جائے تو بغیر اس کے کہ بھگدڑ کی صورت ہو منظم پسپائی یعنی ORDERLY RETREAT کی شکل میں اہلِ ایمان کی نفری کو بچا کر دشمن کے نرغے سے نکال لایا جائے تاکہ وہ اپنے مرکز یا BASE کی جانب سمٹ کر اپنی بڑی جمعیت سے جا ملے اور مقصد یہاں بھی محض جان بچانا نہ ہو بلکہ از سرِ نو حملہ آور ہونا ہو۔ آیات زیرِ درس میں اس قسم کی پسپائی کی بھی اجازت وارد ہوئی ہے اور اُسے بھی وعید سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں ایک دقّت یہ پیش آ سکتی ہے کہ اصل فیصلہ کن معاملہ انسان کی نیت اور اُس کے حقیقی ارادے کا ہے جس پر حتمی حکم لگانا ممکن نہیں ہوتا۔ اور دیکھنے والے کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ صورت "تَحَرُّف للقتال" یا "تحیُّزٌ اِلیٰ فِئَۃٍ" کی نہیں ہے بلکہ "فرار عن الموت" کی ہے۔ چنانچہ بالکل یہی صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران غزوۂ موتہ کے موقع پر پیش آئی تھی، کہ مسلمانوں کا لشکر کل تین ہزار پر مشتمل تھا اور ادھر شرجیل بن عمر ایک لاکھ کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ ظاہر ہے کہ مقابلے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور یہ صرف ذوقِ شہادت تھا جس کی سرشاری میں مسلمان اُن سے بھڑ گئے، چنانچہ یکے بعد دیگرے تین جلیل القدر صحابہ کمان کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ بعد میں عَلَم حضرت خالد بن ولید کے ہاتھ آیا اور انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ مسلمانوں کو رومیوں کے غلبے سے نکال لیا۔ اب جب یہ لشکر مدینہ واپس پہنچا تو بہت سے مسلمانوں نے ان کو فراری قرار دیا، اور بجائے اظہارِ غمخواری و ہمدردی کے ان کے سروں پر خاک ڈالنی شروع کر دی۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باوجود کہ خود آپؐ کو حضرت زید ابن حارثہ، حضرت عبداللہ ابن رواحہ،

اور حضرت جعفر طیّار رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسی عظیم شخصیتوں کی شہادت پر حد درجہ صدمہ پہنچا تھا، لوگوں کے اس قول کی تردید فرمائی اور تسلّی آمیز انداز میں ارشاد فرمایا: "تم لوگ فراری نہیں ہو بلکہ دوبارہ حملہ کرنے کی نیّت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو ـــــ الغرض اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرنے والوں کا صرف جان بچانے کی خاطر میدانِ جنگ سے فرار تو بدترین گناہ ہے، جس کی سزا بھی سخت ترین ہے یعنی حوالۂ جہنم ہونا ـــــ لیکن اس سے مستثنیٰ ہیں تین صورتیں: ایک یہ کہ معاملہ باقاعدہ جنگ کا نہ ہو بلکہ مہم ہی چھاپہ مار نوعیّت کی ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی وقت پیچھے ہٹ آنا محض ایک جنگی چال کے تحت ہو یعنی یہ پسپائی TACTICAL MOVE کی نوعیّت کی ہو نہ کہ بھگدڑ کی اور تیسرے یہ کہ کسی وقت لشکرِ اسلام کے تحفّظ کے لیے منظّم پسپائی یعنی ORDERLY RETREAT ناگزیر ہو جائے ـــــ اور یہ باقاعدہ کمانڈر کے حکم کے تحت ہو۔ واللہ اعلم

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

بقیہ: حکم و عبر

علیحدہ سے بیعت کر کے تنظیم میں شرکت اختیار کرلی)

یہ امریکہ میں میرے اس سفر کا آخری پروگرام تھا جو انگریزی محاورے کے مطابق Last But Not The Least کا مصداق ثابت ہوا۔ اسی رات کو JFK ایئرپورٹ سے پیرس کے لئے روانگی ہوگئی۔ اور اس طرح ۳۷ دنوں پر محیط اس "مشقِ سخن" کے ساتھ "چکی" کی بجائے مسلسل سفر کی مشقت اختتام پذیر ہوئی۔ اس کے دوران اگر کوئی خیر بن آیا تو یہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور تائید و نصرت کا مظہر ہے اور اگر کوتاہی ہوئی تو اپنی کم ہمتی اور کم کوشی کے باعث۔ بہرحال اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ اور کوتاہیوں اور غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ناموں کو بگاڑنے کا غلط رواج

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی

شیخ المشائخ مولانا نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کی نظر ایک کامل مصلح کی طرح مسلم معاشرہ کے بگاڑ کے ہر پہلو پر تھی۔ وہ دَور کانفرنسیں منعقد کرنے' اخبارات و رسائل میں مضامین شائع کرنے اور محلّہ محلّہ وعظ کی محفلیں قائم کرنے کا نہیں تھا۔ مشائخ کی خانقاہیں' مدرسہ و مسجد' دارالاصلاح اور دارالہدایت اور اس کے ساتھ ہی ضرورت مندوں کیلئے دارالقیام اور دارالطعام ہوتی تھیں اور مشائخ کے مریدین اسلام کی چلتی پھرتی تبلیغ کی حیثیت رکھتے تھے اور انہیں سختی سے اسلامی زندگی اور محمدیؐ اخلاق کا عملی نمونہ بناکر عوام میں پھیلایا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ ایک مجلس میں شیخ علیہ الرحمۃ نے نام رکھنے کے ایک نہایت ہی غلط رواج کی نشاندہی فرمائی۔ فرمایا:

(۱) اَحبُّ الاسماءِ عنداللّٰہ عبدُاللّٰہ و عبدُالرحمٰن

(۲) اَصدَقُ الاسماءِ الحارث

(۳) اَکذَبُ الاسماءِ المَالِکُ وَ الخَالِدُ ---- زیراکہ مالک خداوند تعالیٰ است و جاوید ہم ہمونست (جلد ۵' مجلس ۱۴' ص ۹۹۲)

ان کی مجلس میں یہ بحث چل نکلی کہ ناموں میں اچھا نام کونسا ہے؟ شیخؒ نے فرمایا: تین قسم کے نام ہیں۔ ایک وہ نام جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں اور وہ ہیں عبداللہ اور عبدالرحمٰن وغیرہ' یعنی وہ نام جن سے بندہ کی حقیقت (بندگی) اور خدا تعالیٰ کے مقامِ الوہیت اور آقائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے وہ نام جن میں صداقت ہے جیسے الحارث (کھیتی کرنے والا) یعنی انسان کی حقیقت یہی ہے کہ وہ کھیتی کرتا ہے' نیک اعمال کی کھیتی یا برے اعمال کی کھیتی۔ تیسرے وہ نام ہیں جو مسمّٰی (جس کا نام رکھا جائے) کے اعتبار سے جھوٹے اور خلافِ واقعہ ہیں' جیسے کسی انسان کا نام مالک اور خالد رکھ دیا جائے' حالانکہ

حقیقت میں مالک اور ہمیشہ رہنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔

شیخ علیہ الرحمۃ نے تیسری قسم کے ناموں کی مخالفت فرمائی' حالانکہ نام رکھنے والوں کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ یہ شخصِ مسمّٰی حقیقی مالک و جاوید ہستی ہے' بلکہ مجازی طور پر خدا کے ان صفاتی ناموں کو برکت حاصل کرنے کی نیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن شیخ علیہ الرحمۃ شرک کے معاملہ میں شبہ و اشتباہ کو بھی غلط سمجھتے ہیں' کیونکہ جب دوسرے نام موجود ہیں تو پھر شبہ میں ڈالنے والے نام کیوں استعمال کئے جائیں؟ یہ حقیقی مشائخ تھے' جو شرکِ جلی کے علاوہ شرکِ خفی پر بھی نظر رکھتے تھے اور مسلمانوں کو اس سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔

سجدۂ تعظیمی کے بارے میں بھی شیخ محبوبِ الٰہیؒ کی تعلیمات میں اتنی ہی احتیاط ہے جسے راقم نے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ خانقاہوں کے موجودہ غلط رسوم و رواج کی وجہ سے مشائخِ کبار کی صحیح تعلیمات پر پردہ پڑگیا ہے۔ اس ناچیز نے چشتی بزرگوں کی معمول بہا (بقول شاہ عبدالعزیزؒ) کتاب "فوائد الفواد" کی مجلسوں کی تلخیص مع تحقیقاتِ احادیثِ نبویؐ کرکے موجودہ خانقاہی رسوم کے خلافِ شریعت ہونے پر مدلل بحث کی ہے۔ پیش نظر مضمون اسی کا ایک حصہ ہے۔ بہرحال شیخ علیہ الرحمۃ نے دراصل شاہی حلقوں میں پھیلی ہوئی اِس خاص بدعت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا' لیکن اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق اس درباری بدعت کی طرف کوئی اشارہ نہیں فرمایا بلکہ عمومی انداز سے اصلاح فرمادی۔

اسمائے حسنٰی کی اقسام

اسمائے حسنٰی' خدا تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں جن سے خدا تعالیٰ کی صفات کے درجۂ کمال کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں اسمائے حسنٰی کی تعداد ننانوے بیان کی گئی ہے' لیکن اس تعداد میں مشہور اسمائے حسنٰی بیان کئے گئے ہیں اور دوسری حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اسمائے حسنٰی شمار و تعداد سے زیادہ ہیں۔ مشہور دعائے عبدیت کے الفاظ یہ ہیں:

اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسمٍ ھُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِی کِتَابِکَ اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِکَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِہٖ فِی عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِی ....

"میں تجھ سے اے اللہ! تیرے ہر نام پاک کے توسل سے سوال کرتا ہوں جو نام تو نے خود رکھا ہے یا اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا وہ نام تیرے پاس علمِ غیب میں مخفی ہے کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار بنادے....."

ترمذی کی شرح احوذی میں امام ابوبکر ابن عربی نے لکھا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث پاک سے جمع کرنے پر اسمائے حسنیٰ کی تعداد ایک ہزار ثابت ہوتی ہے۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۹)

خاص الخاص اسماء اور مشترک اسماء

ان اسمائے حسنیٰ میں کچھ صفاتی نام ایسے ہیں جو قرآن کریم میں خدا کی ذات کے علاوہ مخلوق کے حق میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جیسے رحیم' رؤف' مالک' ملک' رشید' کریم' علی' عزیز۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو "الرحمٰن الرحیم" کہا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی "رؤف رحیم" فرمایا گیا: **حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ** (التوبہ: ۱۲۸) اللہ تعالیٰ کو "**مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ**" کہا گیا اور داروغۂ جہنم کا نام بھی "مالک" ہے جسے اہلِ جہنم پکاریں گے: **وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ إِنَّكُم مَّاكِثُونَ** (الزخرف: ۷۷) کہ اے جہنم کے داروغہ! تیرا پروردگار جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ کرکے ختم کرے۔ جواب آئے گا' تم لوگ اس سزا میں ہمیشہ رہو گے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو "ملک" کہا گیا۔ **فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ** (طٰہٰ: ۱۱۴) اور **الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ** (الحشر: ۲۳) اور مصر کے حکمران کو بھی۔ **قَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ** (یوسف: ۵۰)

اب غور کرو! اقتدار کی خوشامد پسندی میں لفظ "مَلِک" کی جو بے قدری کی گئی ہے وہ توحید کی دعویدار قوم کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ حکمرانوں کیلئے ملک معظم' ملکہ معظمہ (انگریزی حکومت میں برطانوی حکمرانوں کیلئے) جلالۃ الملک (مسلم حکمرانوں کیلئے) شاہی درباروں سے علماء اور فضلاء کی خوشامد پسندی کے صلہ میں انہیں مَلِکُ العلماء' مَلِک الشعراء اور مَلِک الحکماء کے خطابات دیئے گئے۔ مغل حکمرانوں کے دربار میں شاہ جہان' عالم پناہ اور ظلِّ الٰہی کے نعرے بلند کئے جاتے تھے اور اسی مشرکانہ خوشامد پسندی کی انتہائی معراج تھی کہ جلال الدین اکبر کو خدائی کا درجہ دے کر اس کی پرستش شروع کرادی گئی۔

ہندوؤں میں تو راجہ مہاراجہ بھگوان کا روپ ہوتے ہیں لیکن ان مسلمان علماء کو کیا ہوگیا تھا جو الوہیت اور حاکمیت کو خدا کی ذات کیلئے خاص ماننے کا دعویٰ کرتے تھے اور اکبر کو "مہابلی" اور "جہاں پناہ" کہہ کر پکارتے تھے' حالانکہ اسلام نے توحید کی حفاظت کیلئے ہر سطح پر شخصیت پرستی کی روک تھام کی' آسمانی نمائندوں کو رسول (پیغام پہنچانے والا) اور نبی (خبر دینے والا) کہا' نبی کے جانشینوں کو خلیفہ (نائب) اور امیر و امام کے القاب دیئے' مقبول بارگاہ بندوں کو ولی اور اولیاء کہا گیا یعنی اللہ کے پیارے بندے۔

اسمائے حسنیٰ کی دوسری قسم ان خاص الخاص اسماء کی ہے جنہیں کتابِ الٰہی اور احادیثِ نبویؐ میں خدا کے سوا کسی مخلوق کیلئے استعمال نہیں کیا گیا۔ جیسے رحمٰن' غفار' سبحان' ستار وغیرہ۔ لفظ "اللہ" اسم ذات کی حیثیت رکھتا ہے' جو تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے۔

نام رکھنے کا مسئلہ

مسلمان برکت کے طور پر خدا کے صفاتی ناموں پر اپنے نام رکھتے ہیں' لیکن اسی کے ساتھ مسلمانوں میں ناموں کو بگاڑنے کا رواج بھی عام ہے اور نام کے آخری لفظ سے لوگوں کو پکارا جاتا ہے۔ جہاں تک مشترک اسماء کا تعلق ہے ان میں اگر کسی کو عبدالرحیم' عبدالکریم یا عبدالعلی کہنے کے بجائے رحیم' کریم یا صرف علی کہہ کر پکارا جائے تو ان پاک ناموں کے ساتھ بے ادبی کا پہلو ہے لیکن اگر یہ تخفیف خاص الخاص اسماءِ حسنیٰ میں کی جاتی ہے اور عبدالرحمٰن کو صرف رحمٰن کہہ کر پکارا جاتا ہے تو اسے فقہاءِ اسلام نے حرام اور گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ نام جتنی مرتبہ منہ سے نکلتے ہیں گناہ کبیرہ لازم آتا ہے اور سننے والا بھی گناہ سے محفوظ نہیں رہتا۔ (معارف القرآن جلد ۴' ص ۱۳۳)

ہمارے ہاں کتنے رحمٰن پہلوان' غفار کالئے' ستار لنگڑے' سبحان فیکٹری والے' ستار کباڑیئے' غفار حلوائی اور قدوس لباڑیئے (بے ہودہ گو) ہیں۔ پھر ان ناموں کے ساتھ دہلی والے جو اَبے تَبے کرتے ہیں' لڑائی میں رحمٰن' ستار اور غفار کے الفاظ بول کر آپس میں گالم گلوچ ہوتی ہے' یہاں تک کہ غفار کے باپ اور ستار کی ماں بہن کو پُنا جاتا ہے'

آخر اس بدتہذیبی کا شرعی گناہ ہماری نظروں سے کیوں اوجھل ہوگیا؟

اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ حضورؐ پر درود و سلام پڑھنا واجب ہے' لیکن ہمارے ہاں ان ناموں کے ساتھ گستاخی کا جو افسوس ناک عمل جاری ہے اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے۔ "محمد کھدرے" جامع مسجد کے علاقہ کا مشہور نام ہے۔ دلی میں جس کے چہرے پر سیتلا کے داغ ہوتے ہیں اسے کھدرا کہا جاتا ہے۔ محمد پہلوان --- پھر پہلوانی کے ساتھ جتنی بھلائیاں' برائیاں وابستہ ہیں وہ سب اسی نام پاک کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔ حضرات انبیاء کے ناموں کے ساتھ' خلیل چرسیا' یعقوب سٹے باز' ابراہیم چوڑی گھس (منہیار تھے) یعقوب کفن کھسوٹ (قبرستان نبی کریمؐ کا گورکن تھا) یوسف مسخرا (مستری یوسف مشہور تھا) جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مشہور شیرِ میوات' قبرستان ہندیان کے نگران کو "علی شیرِ اموات" کا نام دیکر حضرت علیؓ جو شاہ مرداں تھے' کے نام کی یہ گت بنائی جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے اسمائے گرامی اور حضورؐ کی صاحبزادیوں کے مبارک نام بھی اسی طرح بگاڑے جاتے ہیں۔ عائشہ صدیقہؓ کو عَیشاں اور عاشیہ' فاطمۃ الزہراء کو فاتو' پھر ان مقدس ناموں کے ساتھ بے ادبی' اری عائشہ' اری فاطمہ۔ بدزبان شوہر اور بدزبان ساس' نندیں ان ناموں کے ساتھ جو گستاخیاں کرتی ہیں وہ مسلم معاشرہ کا نہایت افسوسناک پہلو ہے اور ناقابل بیان ہے۔

لفظ اللہ کے ساتھ گستاخی

اللہ کا لفظ اسم ذات کے طور پر بولا جاتا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک لفظ میں خداوندِ عالم کی تمام صفاتِ کمال کا تصور موجود ہے۔ ہمارے ہاں حبیب اللہ کو "بُلّا" اور قدرت اللہ "قُلّا" کہا جاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ بگاڑنے والوں نے "ت" اور "ب" لگادی۔ پہلے شرفاء میں ایک بچہ کا نام بھی پورا لیا جاتا تھا' پیار میں نام بگاڑنے کو غلط سمجھا جاتا تھا۔ گھر کے ملازمین کو بھی پورے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ حضرت سید محمد گیسو دراز خلیفہ حضرت مخدوم نصیرالدین چراغ دہلوی کا واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں کسی صاحب نے

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

اسلامی ثقافت کے آئینے میں
نوجوان نسل کا کردار(۲)

ازقلم : عبدالماجد
لیکچرر بائیالوجی، گورنمنٹ کالج، اکوڑہ خٹک (نوشہرہ)

فنونِ جمیلہ و فنونِ لطیفہ[۱] اور اسلام

جیسا کہ بیان کیا ہے کہ اسلام ایک دین ہے اور ایسا ضابطۂ حیات ہے جس کے تمام اجزاء ایک کل میں مربوط ہیں اور اس کا مقصد فرد و معاشرہ کی اصلاح و تعمیر ہے۔ اس کے اپنے کچھ اخلاقی و روحانی معیار اور پیمانے ہیں اور اپنا ایک مزاج اور تشخص ہے۔ اور فنونِ جمیلہ اور فنونِ لطیفہ کی حیثیت اس کے مقابلے میں دین یا زندگی کے نہج و اسلوب کی نہیں محض ذرائع ابلاغ کی ہے۔

اسلام جمالیاتی نقطۂ نظر (Aestheticview) کی اہمیتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ اس سے ذرائع ابلاغ، تعمیر اور بلند کرداری کا کام لیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام جمالیات اور فنونِ لطیفہ (Fine Arts) سے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ اس کے ذریعے انسانی فکر کی زلفِ دوتا سنور جائے اور اس کے کردار و عمل میں

۱۔ فنون لطیفہ (Fine Arts) میں تصویر کشی، خطاطی، موسیقی، معماری، تزئین و آرائش اور انسانی مدد و تفریح کے پہلو شامل ہیں۔

۲۔ چونکہ خلفائے راشدین کے دور کے بعد مسلمانوں نے مختلف فنون میں کہیں کہیں تجاوزات کیں اور اسلامی حدود کو پھلانگ لیا اس لئے ہمیں دو طرح کی اصطلاحات کا استعمال کرنا چاہئے۔ یعنی اسلامی میراث اور مسلمانوں کی میراث یا ثقافت۔ اس لئے جہاں اسلامی اصولوں کا خیال نہیں رکھا گیا وہ غیر اسلامی میراث ہے جیسے موسیقی، مجسمہ سازی وغیرہ میں حد سے زیادہ تجاوز۔ چنانچہ ایسی میراث اور ثقافتی ورثہ کا مٹ جانا ہی بہتر ہے۔

حسن و جمال کی تابانیوں کو اس ڈھب سے سمودیا جائے جس سے شرفِ انسانیت کی روایات زندہ و تابندہ نظر آئیں۔

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

اسلام[۳] فن برائے فن کے نظریہ کو فرسودہ قرار دے کر فن برائے تعمیر کے نظریہ کو رواج دینا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل اہمیت اس حسین و جمیل عقیدہ اور اس سے پھوٹنے والے عمل کی ہے جس کو قرآن عمل صالح کہہ کر پکارتا ہے۔ John Keats نے بجا طور اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ حسین تحریر و انشاء (اور دوسرے فنون) کا مقام بہرحال حسنِ عمل کے بعد ہے' یعنی پہلے کردار و عمل کی استواری اور پاکیزگی کا درجہ ہے' اس کے بعد تحریر و انشاء کی اہمیت ہے۔[۴]

رقص و مجسمہ سازی بمقابلہ (verses) اسلام

اسلامی تہذیب و ثقافت سابقہ اور موجودہ تمام ثقافتوں سے اس باب میں ممتاز ہے کہ اس کا منتہائے مقصود احترامِ آدمیت ہے۔ ع اصلِ تہذیب احترامِ آدم است! اس لئے اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ عورت' جسے ماں بننا ہے' جسے بلند کردار اور پاکیزہ نگاہ افراد کو جنم دینا ہے' اور جسے گھر کی چاردیواری کی حد تک اور اسی طرح باہر بھی عفاف' اخلاص' متانت' وقار اور انسانی شرف کے تقاضوں کو ملحوظ و زندہ رکھنا ہے سرِعام ناچے اور جسم کے پیچ و تاب کا اس طرح اظہار کرے کہ ہر دیکھنے والا کلیجہ تھام کے رہ جائے (بلکہ اس طرح مرد کو بھی ناچنے اور رقص کی اجازت نہیں جیسا کہ

۳۔ اس سے یہ بات نہیں سمجھ لینی چاہئے کہ اسلام تفریح کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اسلام نے بعض مواقع پر موسیقی مثلاً دف بجانے اور ملی نغمے گانے کی اجازت دی جیسے نکاح' ختنہ یا سفر کٹنے کے لئے' لیکن ان میں اس کی کچھ حدود ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا محمد شفیع کی کتاب "اسلام اور موسیقی" شائع کردہ مکتبہ دینیات' لاہور۔

۴۔ اس آرٹیکل میں مولانا محمد حنیف کے مضمون "اسلام کے تصور ثقافت" کے علاوہ "نقوشِ اقبال" ص ۹۸' ۹۹ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

موجودہ گلوکار اور اداکار کرتے ہیں۔)

مغرب نے اگر اس کی حوصلہ افزائی کی ہے تو اب اس کی سزا اسے مل رہی ہے۔ آج وہ گھر کے اس سکون' اس روحانیت اور تقدس سے محروم ہے جس کو ایک عفیف و پاکباز عورت ہی قائم رکھ سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رقص و سرود سے کلب آباد ہیں مگر اس کی وجہ سے گھروں میں جو سناٹا ہے اور ازدواجی تعلقات میں نفاق کی جو عفونت ہے وہ کس درجہ تکلیف دہ ہے (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْ ذٰلِکَ الْکَرَبِ) اسی طرح مجسمہ سازی' جس سے شرک پھیلتا ہے' اسلامی فقہ و تہذیب میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

الغرض اسلامی ثقافت ہمارا وہ قیمتی اثاثہ ہے جسے ہم نے سلف صالحین سے ورثہ میں پایا ہے' جو کہ توحید' وحدتِ انسانیت' احترامِ آدمیت' اخوت' رواداری اور علم کے قیمتی موتیوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت (الدّین) کے یہی وہ اصول اور بنیادیں ہیں جنہیں سینے سے لگا کر ہمارے اسلاف چار دانگِ عالم میں پھیل گئے اور زندگی کے ہر شعبہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی وجہ سے یورپ (اور اسی طرح امریکہ اور روس جو کہ اِسوقت اپنے آپ کو سائنس و ٹیکنالوجی کا امام اور واحد اجارہ دار سمجھتے ہیں) کی شبِ تاریک (ساتویں صدی سے تیرہویں صدی تک) میں علم کا آفتاب طلوع ہوا جس کی ضیا پاشیوں سے بالآخر یورپ کا Dark Period اختتام پذیر ہوا جو کہ یورپ اور مغرب کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) پر منتج ہوا۔

چنانچہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا وہ تاریخی کارنامہ ذرا تفصیل سے نوجوان نسل کے سامنے رکھ دیا جائے اور بعد ازاں مسلمانوں کے زوال کے اسباب بھی بیان کردیئے جائیں تاکہ نوجوان نسل بفحوائے حدیث "مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا" کے مطابق اپنے کردار و عمل کو اس طرح سنوارے تاکہ وہ دوبارہ اسلامی تہذیب کو صحیح صورت میں جلوہ گر دیکھ سکے اور اس طرح بارِ دگر دنیا کو "مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ" کی راہ دکھا کر جنت کی ابدالآباد خوشیوں اور نورانیت سے ہم کنار کر سکیں۔

۵۔ عورت کی آوارگی کے نتائج بد کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کی کتاب "اسلام اور عصرِ رواں" اور انہی کی "میری آخری کتاب"

مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے[۶]

نیک اگر بینی مسلماں زادہ است
ایں گہر از دستِ ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے قرآن اور اسوۂ رسولؐ سے راہنمائی حاصل کرکے زندگی کے ہر شعبہ میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی۔ انکے قدم جہاں بھی پہنچے' ساتھ ہی علم کی شمعیں بھی وہاں فروزاں کیں۔ چنانچہ مکہ' مدینہ' یمن' دمشق' قاہرہ' اسکندریہ' کوفہ' بصرہ اور نیشاپور ہی میں نہیں بلکہ شام' مصر' عراق' ایران' اور ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں میں بھی علمی درسگاہیں قائم کیں۔ الرشیدیہ' امانیہ' ترخانیہ' خالونیہ' شریفیہ (شام میں)' رمیہ' صلاحیہ (مصر میں)' المستنصریہ اور نظامیہ جیسی عظیم درسگاہیں اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ عہدِ اسلامی میں اندلس میں کئی کالج اور دینی ادارے کھولے گئے۔ تنہا قرطبہ میں کئی سو درسگاہیں تھیں جن میں دینی علوم کے علاوہ فلسفہ' ادب' تاریخ اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں اشبیلیہ' غرناطہ' ملاقہ' سمرقند' اصفہان' مرو' بخارا اور حلب وغیرہ میں مسلمانوں کے دور میں عظیم یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔

ادھر مسلمان علمی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے شہرت کے آسمان پر ستارے بن کر چمک رہے تھے تو دوسری طرف "یورپ کے باشندوں میں وحشت و بربریت تھی۔ ان کی نسبت بڑی مشکل سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس وحشیانہ حالت سے باہر نکلیں گے۔ یہ لوگ جنگلوں میں جھونپڑے بنا کر رہتے تھے اور گھاس پر چلتے تھے۔ برے حالوں لوبیا' باقلا' اور پیڑوں کی چھال تک کھا کر گذارہ کرتے۔ ادھر یورپ کے جنوب مغربی حصے کی طرف

۶۔ اس آرٹیکل میں زیادہ تر "مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے" اور "طوفان سے ساحل تک" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

توجہ دیں تو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ شمالی افریقہ کے عرب آباد کاروں نے آکر ایک تابناک تہذیب پروان چڑھائی"۔۔۔۔اور بقول سٹینلاس :"ازمنۂ وسطیٰ میں اسلام ہی کی تاریخ بنفسہٖ تہذیب و تمدن کی تاریخ ہے۔[۸]"

آج جو یورپ' امریکہ' روس یا کہیں بھی سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی نظر آتی ہے' حقیقت میں وہ سب اسلام ہی کا صدقہ ہے۔ بقول موسیو گار مٹن (فرانسیسی مستشرق) "اسلام ہی نے دنیا کی علمی اور عمرانی ترقی کے لئے ہر قسم کے ذرائع یورپ کو بہم پہنچائے۔ اگرچہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا اعتراف نہ کرے مگر امر واقعی یہی ہے۔[۹]"

؎ بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

لیکن جب مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ سے ہدایت حاصل کرنا چھوڑ دی' ان کی بجائے مسلمانوں میں عجمی افکار و تصورات پھیل گئے تو پھر اسلام ایک نظامِ عمل اور طریقۂ زندگی کے بجائے صرف عبادات اور (عیسائیت کی طرح) روحانی ترقی تک (عجمی تصوف کی وجہ سے) محدود ہو کر رہ گیا اور یوں دین اور دنیا کی تفریق شروع ہوئی۔ چنانچہ ان میں علمی شوق اور جذبۂ جہاد' جو ان کی تہذیب و تمدن کو فروزاں کئے ہوئے تھا' سرد پڑ گیا۔ نتیجۃً عالمی سیاست و قیادت کا عالی منصب جو کہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے ہاتھوں میں تھا' غیر اقوام نے چھین لیا جس پر وہ آج تک قابض ہیں۔[۱۰]

۷۔ ملاحظہ ہو ڈریپر کی کتاب "Intellectual Development of Europe" کا ص ۲۸'۲۷

۸۔ "Encyclopedia of Religion" بحوالہ مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے" از مولوی نور احمد۔ شائع کردہ فیروز سنز' کراچی' لاہور' راولپنڈی۔

۹۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "محمد رسول اللہ' غیر مسلموں کی نظر میں" از حنیف یزدانی

۱۰۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب" از الحاج عبدالکریم جرمانوس

نوجوان نسل غیروں کی ثقافت کی یلغار میں

اس سے پہلے کہ نوجوان نسل کا کردار بیان کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موجودہ حالت بیان کردی جائے۔ بیسویں صدی ایک لحاظ سے اگرچہ مبارک ہے کہ اس میں اکثر اسلامی ممالک نے استعماری طاقتوں سے نجات حاصل کی اور یوں سیاسی لحاظ سے تو آزاد ہوئے لیکن (لمبے سیاسی غلبے کے اثر کی وجہ سے) ذہنی لحاظ سے وہ ابھی تک غلام ہیں۔ ان کے تعلیمی ادارے' ان کے دفاتر' ان کے بازار' ان کی انجمنیں' ان کی رٹیاں' ان کے گھر حتیٰ کہ ان کے اپنے جسم زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ

ع وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

نوجوان نسل مغرب کے دماغ سے سوچتی ہے' مغرب کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ شعوری اور لاشعوری طور پر ان کے اذہان پر یہ مفروضہ مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے اور باطل وہ ہے جس کو ساحرانِ فرنگ باطل قرار دیں۔ حق' صداقت' تہذیب و ثقافت' اخلاق' شائستگی' ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کیا ہے ع کہ ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!

ادب ہو کہ موسیقی' اخبار ہو کہ فلمیں' وڈیو ہو کہ ٹی وی' ہر جگہ غیر اسلامی شعار واطوار اپنائے جارہے ہیں اور ان کی پیروی میں نوجوان نسل بھی ایسا ہی کر رہی ہے۔ کوئی ڈرامہ اور فلم ایسی نہیں دکھائی جاتی جس میں عورت کے حسن کی نمائش نہ کی جاتی ہو۔ نوجوان شاعروں اور ادیبوں کے قلم سے کوئی ایسا شاہکار نہیں نکلتا جس میں عورت کے حسن وجمال کا ذکر نہ ہو اور بقولِ اقبال ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نگار
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

رقص و سرود کی محفلوں اور پاپ سنگر کے گانوں اور ایکٹنگ کے بغیر پارٹی مکمل ہی نہیں سمجھی جاتی اور مہمان نوازی ادھوری سمجھی جاتی ہے جب تک کہ کھانے کے بعد انڈیا کی کوئی عریاں فلم (Blue Print) یا کم از کم پاکستانی فلم وی سی آر پہ نہ دکھائی

جائے۔[۱۱] ہندو بار بار دھمکیاں دے رہا ہے کہ وہ پاکستان کو سبق سکھا کے چھوڑے گا اور ہم (زندہ دل!) اس کا جواب پتنگوں' ڈوروں' پٹاخوں' ناچ گانوں اور شور شرابے[۱۲] سے دے رہے ہیں۔ سیاچین گلیشیرز پر ہماری فوج ۲۴ ہزار فٹ کی بلندی پر محاذ آرا ہے اور قوم یوں جشن منا رہی ہے جیسے وہ بھارت کو فتح کر چکی ہے۔

مغربی ثقافت کے پھیلاؤ کی وجوہات

بالجملہ سامراجی ثقافت اور اطوار کے پھیلاؤ کی بڑی وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے جدید ذرائع ابلاغ کا بغیر کسی منصوبہ بندی کے اسلامی ممالک میں گھس آنا۔

۲۔ فحش لٹریچر اور غیر ملکی گندے اور رکیک قسم کے ناولوں اور رسائل کا پھیلاؤ اور بڑے شہروں میں جگہ جگہ میوزک سنٹرز کا قیام۔

۳۔ نوجوان نسل کی صحیح علمی و فکری رہنمائی کی عدم موجودگی' علماء اور دانشور حضرات کی اپنے فرضِ منصبی سے غفلت اور کوتاہی۔

۴۔ مغربی نظامِ تعلیم کی وجہ سے ایمان اور آخرت پر یقین کی کمزوری۔

مناسب ہے کہ یہاں مؤخرالذکر دو اسباب پر ذرا تفصیل سے بحث ہو جائے (اول الذکر دو اسباب پر گذشتہ صفحہ پر بات ہو چکی ہے اور آئندہ صفحات میں بھی ان پر کچھ کلام ہوگا۔) ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جو قوم کا مغز (Kernel) ہوتا ہے اور یہی طبقہ مستقبل میں کسی ملک اور معاشرے کی لگامِ اقتدار سنبھالتا ہے (اگر یہ صحیح ہو جائے اور اپنے اندر بلند

۱۱۔ پہلے تو دوستوں سے سنا کرتا تھا لیکن اس بار کراچی (مہمانی پر) جانے کا اتفاق ہوا تو عملی طور پر اس بات کا مشاہدہ بچشم خود کیا۔

۱۲۔ ۱۲ فروری کو پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں بالعموم اور لاہور میں بالخصوص ہندوؤں کا یہ تہوار بڑے جوش و خروش اور ذوق و شوق سے منایا گیا جس پر کئی لاکھ روپے (بلکہ ایک اخبار کے مطابق ۳ کروڑ روپے) خرچ کئے گئے۔ لیکن دوسرے دن اخبار میں پڑھا کہ "بسنت" میں ۲۰۰ سے زیادہ آدمی زخمی ہوئے اور کئی قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا۔ یہ ہیں غیروں کی ثقافتی اقدار اپنانے کے ثمرات۔ (فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ) (پاکستان ٹائمز' ۱۳ فروری ۱۹۸۸ء)

کردار پیدا کرلے تو عوام خود بخود ٹھیک ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ عموماً اپنے مقتداؤں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں) مغربی نظامِ تعلیم کی وجہ سے غیر کے چنگل میں گرفتار ہے اور اگر کوشش بھی کرے تب بھی اس سے نجات حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ اس نظامِ تعلیم نے اس کے رگ و ریشہ میں اسلام دشمنی کوٹ کوٹ کر بھردی ہے۔

مغربی نظام تعلیم (گرچہ مغربی تعلیم حقیقتاً مشرقی اور مسلمانوں کی میراث ہے اور وہ کسی صورت میں بُری نہیں صرف اس میں مغربی واضعینِ تعلیم کے عقائد و نفسیات اور انسان و کائنات کے بارے میں ان کا مخصوص نقطۂ نظر قبیح ہے) اسلامی ممالک میں گہری قسم کی لیکن خاموش نسل کُشی (Genocide) کے ہم معنی ہے اور جدید عُقَلائے مغرب نے پوری نسل کو ہلاک کرنے کی بجائے ان کے ذہن کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کا فیصلہ کیا ہے اور بقولِ اکبر مرحوم۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اقبال وہ مردِ مجاہد ہے جو مغربی تہذیب میں پلا بڑھا اور بالآخر مغربی نظامِ تعلیم سے نئی نسل کو اس طرح باخبر کیا۔

مباش ایمن اَزُو ملے کہ خوانی
کہ اَزوے روحِ قومے می تواں کشت

مزید کہتے ہیں۔

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

اور۔

جس علم کی تاثیر سے زَن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت

اور بقول علامہ محمد اسد "اسلام اور مغربی تمدن زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں اور

ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل مغربی بنیادوں پر تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں پر مبنی ہے) پاکر مخالفِ اسلام اثرات سے پاک ہوسکتی ہے۔[۱۳]"

اسلامی ثقافت کو عملی طور پر زندہ کرنے کا واحد راستہ: نظامِ تعلیم کی تبدیلی

یہ کام اگرچہ کتنا مشکل اور دیر طلب کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا اس کا کوئی حل نہیں کہ موجودہ نظامِ تعلیم کو مسلمان قوم کے عقائد و مسلّمات اور مقاصد و ضروریات کے مطابق ڈھالا جائے اور اس کے تمام علوم و مضامین سے مادہ پرستی' خدا بیزاری' مذہب بیزاری (Theophobia)' اخلاقی اور روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خدا پرستی' آخرت کوشی' تقویٰ شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے۔ یہ کام موجودہ نسل کے ایسے باشعور افراد ہی کرسکتے ہیں جنہوں نے مغربی علوم اور جدید سائنس کے ساتھ اسلامی علوم میں بھی گہری بصیرت پیدا کی ہو۔ اور بقول مولانا مودودی "اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلامی کلچر پھر سے جوان ہو اور زمانے کے پیچھے چلنے کی بجائے آگے چلنے لگے تو اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو دوبارہ قائم کیجئے۔ مگر اس کو قائم کرنے کی صورت یہ نہیں کہ دینیات کے نصاب کو جسمِ تعلیم کی گردن کا قلادہ یا کمر کا پشارہ بنا دیا جائے' نہیں اس کو نظامِ تعلیم و تربیت میں اس طرح اتار دیجئے کہ وہ (اسلامی روح) اس کا دورانِ خون' اس کی روحِ رواں' اس کی بینائی' اس کی سماعت' اس کا احساس و ادراک اور اس کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزاء کو اپنے اندر جذب کرکے اپنی تہذیب کا جزو بنایا جائے۔ اس طرح آپ مسلمان فلسفی' مسلمان سائنس دان' مسلمان ماہرِ معاشیات' مسلمان مقنّن' مسلمان مدبّرین' غرض تمام علوم و فنون کے ماہر تیار کرسکیں گے جو زندگی کے تمام مسائل کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے حل کریں گے[۱۴]"۔

اسی طرح دینی مدارس میں رائج درسِ نظامی میں بھی جدید دور کے تقاضوں کے

۱۳۔ Islam at the Cross Roads

۱۴۔ تنقیحات از مضمون "مسلمانوں کے لئے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل" مصنفہ ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم۔

مطابق توسیع ہونی چاہئے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علمائے کرام اور دینی مدارس کے مہتمم حضرات ایسا نظامِ تعلیم مرتب کریں جو عصرِ حاضر کے تقاضوں اور مسائل کا منہ توڑ جواب دے سکے۔

آج یونانی فلسفوں کا دور نہیں رہا بلکہ سرمایہ دارانہ نظام' سوشلزم' مسئلۂ وطنیت' ڈارونزم اور فرائیڈازم نے جدید مسائل پیدا کردیئے ہیں اس لئے دینی مدارس میں قرآن و حدیث کے ساتھ جدید علوم اور طبعی سائنسز (Physical sciences) کا کورس شامل ہونا چاہئے تاکہ فارغ التحصیل نوجوان "مولوی" ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقنن' ایک سائنس دان اور ایک ماہر معاشیات بھی ہوں جو فلاسفہ جدید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا جواب دے سکیں اور اس طرح نوجوان نسل کو اسلام سے مطمئن کرسکیں[۱۵]

آج ہمارے نوجوان علماء کو فقہی و فروعی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے پر طعن و تشنیع اور کفر کے فتوے لگانے کی بجائے ٹھوس علمی دلائل سے اسلام کے بارے میں جدید ذہن کے شبہات کو دور کرنا ہے۔[۱۶]

علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان وسیع خلیج کو پُر کرنا:

اگر ہم ایک نئی علمی تنظیم کو جنم دینے میں کامیاب ہوگئے اور مغربی نظامِ تعلیم میں تبدیلی اور درسِ نظامی میں جدید دور کے تقاضوں کے مطابق توسیع کردی تو پھر وہ خلیج خود بخود ختم ہوجائے گی جو عرصۂ دراز سے علمائے کرام اور جدید نسل کے درمیان حائل ہے اور اس طرح تمام تعلیم یافتہ نوجوان (چاہے وہ دینی مدارس سے فارغ ہوں یا کالجوں اور یونیورسٹیوں سے) مل کر بہتر طور پر اسلام کی خدمت کرسکیں گے اور دنیا کو بتا سکیں گے کہ اسلام ہی سب سے اعلیٰ دین ہے اور موجودہ تمام مسائل کا حل ہے۔

۱۵۔ مزید تفصیلات اور اصلاحات کے لئے ملاحظہ ہو سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "اسلامی ممالک میں اسلامیت اورمغربیت کی کشمکش" اور مولانا شہاب الدین ندوی کی کتاب "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ' قرآن کی نظر میں"

۱۶۔ پروفیسر طاہرالقادری کی کتاب "موجودہ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے" اور مولانا محمد شفیعؒ کی کتاب "وحدتِ امت"

کامیاب علمی تردید اور احیاءِ حکمتِ دین

یہ زمانہ علمی نظریات کا زمانہ ہے۔ اِس دور میں اسلام کے سوا (الا ماشاء اللہ) تمام نظریات کے قائلین اپنے اپنے نظریات کی علمی و عقلی توجیہہ اور مدافعت بہم پہنچانے میں مصروف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی ترقی کے کسی دور میں باطل کی طرف سے ایسا خطرناک چیلنج کبھی نہیں دیا گیا جیسا کہ اب دورِ حاضر کے افکار نے دیا ہے۔ اس وقت فلسفی' ماہرِ تاریخ' ماہرِ معاشیات اور ماہرِ نفسیات سب مل کر حق اور سچائی کی جڑوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ میکانکی وحیاتیاتی ارتقاء (Mechanical and Biological Evolution) ' تحلیلِ نفسی (Psycho-Analysis) حکمیاتی سوشلزم' تاریخی مادیت' منطقی اثبات (Logical Positivism)' کرداریت' وجودیت (Existentialism)' نازی ازم' فرائیڈازم' نیچرلزم' لا ادریت اور نیشنلزم کے نظریات' جنکی مقبولیت (ان کے قائلین کی کوششوں سے) بڑھ رہی ہے' دین و مذہب کی بنیادوں کو غلط قرار دے رہے ہیں۔

چنانچہ نوجوان نسل کو ان کے علمی چیلنج کا جواب دینا اور اس کی یقین افروز تردید کرنا ضروری ہے۔ ان نظریات کا جواب دیتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ان کا جواب دورِ حاضر کے علمی معیار پر پورا اترے اور اپنے استدلال اور تکنیک اور طریقہ سے دنیا بھر کے چوٹی کے سائنس دانوں اور حکماء کو مطمئن کرسکے ورنہ وہ جواب کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

لیکن نوجوان نسل اس وقت تک جدید نظریات کی اعلیٰ پائے کی تردید نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ روحِ قرآن کو نہ سمجھے' اور روحِ قرآن سے واقفیت قرآن و سیرتِ رسولؐ' صحابہ کرامؓ اور ائمہ و صلحائے امت کی زندگیوں کا براہِ راست مطالعہ' کثرتِ عبادت اور رسول پاکؐ کی ذات بابرکات سے محبت و عقیدت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی' کیونکہ ۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی است

اس لئے نوجوان نسل کو مذکورہ بالا شرائط پر عمل کرتے ہوئے علومِ جدیدہ کے ساتھ دینی

علوم میں بھی گہری بصیرت پیدا کرنی ہے اور تحقیق و تفحص کی تمام کوششوں کو بروئے کار لا کر اسلام کی ایک نہایت ہی معقول اور دلکش توجیہہ (Interpretition) کرنی ہے جو حقیقی بھی ہو اور افراط و تفریط سے پاک بھی ہو۔ کیونکہ فی زمانہ صرف اور صرف مسلمان ہی ہیں جن کے پاس تمام معقول اور دلکش تصورات کا حقیقی سرچشمہ یعنی عقیدۂ توحید موجود ہے۔ یہی عقیدہ اسلام کی روح ہے اور اسی کو انسان اور کائنات کے صحیح اور سائنسی نظریئے کے طور پر اختیار کر سکتا ہے۔

بقیہ: حکمتِ اقبال

فطرتِ اُو سوئے ظلمت بُردہ رخت — حق زتیغِ خامۂ اُو لخت لخت
بت گری مانندِ آزر پیشہ اش — بست نقشِ تازۂ اندیشہ اش
مملکت راوینِ اُو معبود ساخت — فکرِ او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد — نقدِ حق را بر عیارِ سُود زد
باطل از تعلیمِ او بالیدہ است — حیلہ اندازی فنے گرویدہ است
طرحِ تدبیر زبوں فرجام ریخت — ایں خسک در جادۂ ایّام ریخت

اقبال نے ۱۹۳۵ء میں سالِ نو کے موقعہ پر ایک بیان آل انڈیا ریڈیو پر نشر کیا تھا' جس میں اُس نے کہا تھا:

"جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ اور نسل کے امتیازات کو نہ مٹایا جائے گا اُس وقت تک انسان اِس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت اور حریّت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"

محمد یونس جنجوعہ

مساواتِ مرد و زن!

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک جائزہ

مرد اور عورت اولادِ آدم کی دو اصناف ہیں۔ ہر صنف کی اپنی اہمیت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں۔ تاہم شکل و شباہت' حقوق و فرائض اور دائرۂ عمل میں دونوں کے درمیان فرق واضح ہے۔ عورت کو حسن ظاہری میں مرد سے زیادہ حصہ ملا ہے' نیز اس کی صوتی آہنگ میں نرمی اور ملائمت عیاں ہے۔ جبکہ مرد کو نسبتاً توانا' جفاکش اور متحمل بنایا گیا ہے۔ الغرض عورت کی چال ڈھال' گفتگو اور اندازِ نشست و برخاست سے نسوانیت ٹپکتی ہے جبکہ مرد کی حرکات و سکنات اور کیفیات سے رجولیت مترشح ہوتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی انفرادی خصوصیات ان کے اپنے اپنے دائرۂ کار کے لئے انتہائی مفید اور ضروری ہیں۔

جس طرح کسی بھی دو چیزوں میں مساوات کا حکم لگانا آسان کام نہیں اسی طرح مرد و زن کے درمیان محض مساوات کا لفظ لگادینا کافی نہیں بلکہ دونوں کے حقوق و فرائض اور دائرۂ کار کا تعین بھی ضروری ہے جس میں مساوات کا پہلو بھی سامنے آجائے گا۔ مرد و عورت انسان ہونے اور مخصوص حقوق رکھنے کے ناطے تو بہرحال مساوی ہیں مگر یہ مساوات تو اپنی نوعیت میں اس قدر سادہ ہے کہ بہت سی مختلف چیزوں میں موجود ہے۔ مثلاً چرندے' پرندے اور درندے بھی رب کی مخلوق اور جاندار ہونے میں انسان کے مساوی ہیں۔ اگرچہ دائرۂ کار ہر کسی کا الگ الگ ہے اور جب دائرۂ کار کو زیرِبحث لایا جائے گا تو مجموعی اعتبار سے انسان کی دوسرے جانداروں پر فضیلت سامنے آئے گی۔ لیکن ایک صنف کی دوسری اصناف پر فضیلت دوسری اصناف کی مخصوص اہمیت کو چنداں متاثر نہیں کرتی۔ اسی طرح جب مرد و عورت کے دائرۂ کار' عملی زندگی میں حقوق و فرائض اور وظیفہ ہائے زندگی کو زیرِبحث لایا جائے گا تو مجموعی طور پر مرد کی عورت پر فضیلت ثابت ہوگی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ صنف نازک کو غیر اہم قرار دے دیا جائے۔

ماحول پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں پولیس کے اہلکار' فوجی جوان' کالج کے اساتذہ' انتظامیہ کے افسران' محکمہ ڈاک اور ٹیلی فون کے ملازمین نظر آئیں گے۔ ان میں اس اعتبار سے تو مساوات ہے کہ یہ سب حکومت کے کارندے ہیں مگر فرائض کی نوعیت اور اختیارات کی کمی بیشی ان کے درمیان مساوات کا حکم لگانے میں سراسر مانع ہے' اگرچہ اہمیت ہر گروہ کی مسلمہ ہے۔

مرد کی اپنی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے چند مخصوص فرائض کی انجام دہی کیلئے بنایا ہے اور اس کی تخلیق میں طاقت اور شجاعت جیسی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ دفاعِ وطن یا عزت و ناموس کی خاطر ہمیشہ مردوں نے ہی اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور میدانِ کارزار میں متصادم ہوئے۔ اسی طرح جسمانی مشقت کے کام ہمیشہ سے مرد ہی کرتے چلے آئے ہیں' مگر عورت کی اپنی اہمیت ہے کہ امورِ خانہ داری میں حسنِ ترتیب اور سلیقے کے ساتھ نہ صرف وہ مرد کو عظیم الشان کاموں کیلئے تیار کرتی ہے بلکہ نئی نسل کے ذکور و اناث کی صلاحیتیں اسی کی گود میں نشوونما پاتی ہیں۔

اسلام منظم اجتماعی زندگی میں یقین رکھتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق چند افراد مل کر سفر کریں تو انہیں اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کرلینا چاہئے۔ پس خاندان کے نظام کو منظم رکھنے کیلئے صاحبِ خانہ مرد کو سربراہی سونپی گئی ہے[1] اور مرد و زن دونوں کو یہ فیصلہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہئے کہ یہ رب العالمین کی مشیت ہے۔ ہم یہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں مرد و زن کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں جس سے اندازہ ہوسکے گا کہ مرد و زن میں مساوات کس درجہ کی ہے۔

۱۔ قرآن پاک میں اوامر و نواہی کے مخاطب عام طور پر مرد ہی ہیں جبکہ تبعًا وہی احکام عورتوں کیلئے بھی ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ مخاطب عورتیں ہوں اور تبعًا مرد بھی ان میں شامل ہوں[2]

۱۔ "مرد عورتوں پر قوام (حکمران و نگران) ہیں اس بناء پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بناء پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔" (النساء: ۳۴)

۲۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تاکہ تم پرہیزگار بنو" (البقرہ: ۱۸۳) اور اس طرح کی بے شمار آیات۔

۲۔ قرآن پاک میں واضح طور پر مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت دی گئی ہے۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر۲۲۸ میں ہے:"عورتوں کیلئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ (فضیلت) حاصل ہے۔"

۳۔ نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس میں بااختیار فریق مرد کو بنایا گیا ہے۔ نکاح کی ڈور بلااستثناء (exclusively) مرد کے ہاتھ میں ہے یعنی مرد کو یہ قانونی اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے عورت کو طلاق دیکر الگ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت اپنے خاوند سے علیحدگی چاہے تو اس کو عدالت میں اپنی مظلومیت ثابت کرنا ہوگی۔[۳]

۴۔ اسلامی قانونِ شہادت میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر سمجھا گیا ہے۔[۴]

۵۔ اسلامی قانونِ وراثت میں لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملتا ہے۔[۵]

۶۔ عورتوں کا گھروں میں بیٹھنا اور چار دیواری کے اندر کے امور انجام دینا پسندیدہ ہے جبکہ مرد کو روزی کی تلاش میں بیرونِ خانہ کی سرگرمیوں کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔[۶]

۷۔ عورت کی نماز مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا پسندیدہ اور افضل ہے اور برآمدے کی نسبت کمرے کے اندر پڑھنا بہتر ہے جبکہ مرد کیلئے لازم ہے کہ وہ مسجد میں جاکر پنجگانہ نماز ادا کرے۔[۷]

۳۔ البقرہ : ۲۳۲

۴۔ "........اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے" (البقرہ : ۲۸۲)

۵۔ "تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے" (النساء)

۶۔ "اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔"
(الاحزاب : ۳۳)

۷۔ "عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے اور اس کا اپنے اندرونی کمرے میں نماز پڑھنا بیرونی کمرہ میں پڑھنے سے بہتر ہے"
(ابو داؤد عن ابن مسعودؓ)

۸۔ مرد کو منتظم خانہ ہونے کے ناطے اپنی عورت کو تادیبی سزا دینے کی اجازت ہے جبکہ عورت اپنے مرد کی اصلاح کیلئے اسے جسمانی سزا نہیں دے سکتی۔ قرآن شریف میں ہے: "اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہوجائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو۔" (النساء: ۳۴)

۹۔ عورت کا نان و نفقہ اور رہائش کی سہولت مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت پر یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ افراد خانہ کے قیام و طعام کا بندوبست کرے۔ (النساء: ۳۴)

۱۰۔ میدان جنگ میں جہاد و قتال مردوں کی ذمہ داری ہے اور عورتیں اس سے کلیتہً مستثنیٰ ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ عورتیں جسمانی کمزوری کے سبب جنگ و جدال' نیزہ اور تیر و تفنگ اٹھانے کے قابل نہیں۔

۱۱۔ نبوت اور رسالت اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں میں رکھی ہے' کسی عورت کو یہ منصب نہیں عطا ہوا۔ اس حقیقت پر تاریخ انسانیت شاہد ہے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ تسلیم کہ انبیاء و رسل نے عورتوں کے ہاں ہی جنم لیا۔

۱۲۔ نماز باجماعت میں امامت صرف مرد ہی کی ذمہ داری ہے۔ عورت نماز باجماعت میں آگے کھڑی ہوکر امامت نہیں کرسکتی۔ البتہ اگر عورتیں ہی عورتیں مل کر نماز پڑھ رہی ہوں تو اگلی صف کے درمیان کھڑی عورت ان کی امامت کرسکتی ہے' مگر وہ بھی صف سے آگے نکل کر اکیلی کھڑی نہیں ہوگی۔[۸]

۱۳۔ نماز جمعہ اور عیدین چونکہ گھر سے باہر نکل کر ادا کرنا ہوتی ہیں اس لئے عورتوں پر فرض نہیں۔ صرف مردوں پر فرض ہیں۔[۹]

۱۴۔ مردوں کیلئے صرف ستر کے احکام ہیں جبکہ عورتوں کیلئے ستر کے علاوہ حجاب (پردہ) کے احکام بھی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح بلاتکلف گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔[۱۰]

۱۵۔ شادی شدہ عورت کو قرآن میں محصنہ کہا گیا ہے یعنی جو کسی مرد کے زیر

۸۔ سنن ابوداؤد' دار قطنی' بیہقی ۹۔ سنن ابوداؤد' عن طارق بن شہاب

۱۰۔ الاحزاب: ۵۹

حفاظت آچکی ہو۔ گویا مرد عورت کو حفاظت (Protection) دینے والا ہے۔

۱۶۔ ایک مرد ایک ہی وقت میں چار عورتوں کو نکاح میں رکھ سکتا ہے جبکہ ایک عورت کو اجازت نہیں کہ وہ بیک وقت کئی مردوں سے نکاح کرسکے[۱۲]

۱۷۔ حج ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ مرد کو استطاعت ہوتو جب چاہے سفرِ حج اختیار کرسکتا ہے۔ مگر عورت استطاعت کے باوجود حج کا سفر اختیار نہیں کرسکتی جب تک کوئی محرم مرد اس کے ساتھ جانے والا نہ ہو[۱۳]

۱۸۔ مرد جب چاہے نفلی روزہ رکھ لے۔ مگر شادی شدہ عورت اپنے موجود شوہر کی اجازت سے ہی نفلی روزہ رکھ سکتی ہے[۱۴]

۱۹ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اللہ کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو کہتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں[۱۵]"

۲۰۔ جس عورت کو طلاق ہوجائے یا اس کا شوہر فوت ہوجائے تو وہ عدت کی مدت گزار کر ہی دوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے' مگر کسی مرد کی بیوی فوت ہوجائے یا وہ اسے طلاق دے دے تو وہ بلا انتظار کسی دوسری عورت سے نکاح کرسکتا ہے[۱۶]

۲۱۔ نماز جنازہ صرف مردوں پر فرض ہے' عورتوں پر نہیں۔ یہ بھی اس لئے کہ عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا پسندیدہ نہیں[۱۷]

مذکورہ بالا شواہد سے مرد اور عورت کے دائرہ ہائے کار اور حقوق و فرائض کا تعین چنداں مشکل نہیں رہا۔ رہا یہ سوال کہ جدید دور ہے اور اس کے جدید تقاضے ہیں' اس میں آبادی کے نصف حصے کو گھر کی چار دیواری میں پابند رکھنا مناسب نہیں جبکہ عورت

۱۱۔ النساء: ۲۴ ۱۲۔ النساء: ۳

۱۳۔ ترمذی۔ سنن ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ ۱۴۔ شرح التنویر جلد اول صفحہ ۱۹۶

۱۵۔ جامع ترمذی عن ابی ہریرہؓ۔ سنن ابی داؤد عن قیس بن جد۔ سنن ابن ماجہ عن عبداللہ بن ابی اوفی۔ مسند امام احمد عن انسؓ و عن عائشہؓ

۱۶۔ البقرہ: ۲۲۸' ۲۳۴ ۱۷۔ بخاری عن ام عطیہ

نے وہ تمام کام کر دکھائے ہیں جو مرد کرتا ہے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مندرجہ بالا شواہد اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں جن کے اصول خود خالقِ کائنات نے وضع کئے ہیں وہ ہر دور کے تقاضے جانتا ہے' اس لئے یہ اعتراض سرے سے غلط ہے کہ اسلامی تعلیمات جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انسانی ذہن خالقِ فطرت کے وضع کردہ قوانین کو ازخود غلط سمجھ بیٹھے مگر ایسا انسان بھی راہِ گم گشتہ کی کیفیت سے نکل کر اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ خالقِ کائنات کے دیئے ہوئے قوانین ہی بہترین ہیں۔ عورت کے حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط کا یہ نیا تجربہ نہیں بلکہ اس سے قبل یہ کئی مرتبہ آزمایا گیا ہے مگر ہر دفعہ نتائج بد سے بدتر نکلے۔ آج بھی مغرب میں مخلوط معاشرے کا رواج اور عورت پر بیرونِ خانہ کی ذمہ داریاں ڈال کر خاندانی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا گیا ہے اور نتیجۃً یہ یورپی دانشور اپنی غلطی تسلیم کر رہے ہیں اور زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مرد و عورت کے وہی حقوق و فرائض جو اسلام نے پیش کئے ہیں متوازن' معتدل اور اقرب الی الفطرت ہیں۔ مشہور فرانسیسی دانشور روسو نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "عمرانی معاہدہ" (Social.Contract) میں لکھا ہے: "یہ عورت کے رول میں ہے کہ وہ گھر میں رہے' گھر کو درست رکھے' بچوں کی نگہداشت کرے' گھر کے مردوں کو اس قسم کی تعلیم دے کہ وہ اچھے شہری بن سکیں' مگر عورت کو اس میدان میں خود کبھی دخل نہیں دینا چاہئے۔" نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ایلیکس کیرل نے اپنی مشہور کتاب "انسان نا دریافت" میں لکھا ہے: "عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں اور مردوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا مردوں کا ہے۔ ان کو اپنے مخصوص عمل کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

زمانہ قدیم سے عورت کی حیثیت' مقام اور حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط رہا۔ ہر دفعہ نتیجہ یہی نکلا کہ عورت کی سرگرمیاں گھریلو نوعیت کی ہیں' اسے مردوں کے شانہ بشانہ بیرونِ خانہ کے پر مشقت کاموں میں الجھانا ہمیشہ انتشار و فساد کا باعث ہوا۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو (جس کی وفات ۳۲۲ قبل مسیح میں ہوئی) نے اپنی کتاب "سیاسیات" میں لکھا ہے: "سیاست میں عورت کا کوئی رول نہیں ہے۔ اس کا ان فیصلوں

میں کوئی ہاتھ نہیں ہونا چاہئے جو خاندان سے باہر خلقِ خدا کی بہتری کیلئے کئے جاتے ہیں۔"

آج اگر چند عورتوں نے بیرونِ خانہ کے وہ کام جو مردوں کے شایانِ شان ہیں کر دکھائے ہیں تو اس میں چنداں تعجب کی بات نہیں۔ عورتوں کی ایک قلیل تعداد میں غیر معمولی صلاحیتوں کا پایا جانا مستثنیات میں شمار ہوتا ہے اور مستثنیات کو عموم کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے برعکس عورتوں کی اس کارکردگی نے جو منفی اثرات پیدا کئے ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔ مغربی معاشرے میں جہاں عورتوں کو کھلے بندوں مردوں کے ساتھ مسابقت (Compete کرنے) کے مواقع ہیں وہاں بھی جن عورتوں کی کارکردگی عمدہ قرار دی جاسکتی ہے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ سائنس کا نوبل پرائز پانے والے ۲۷۸ افراد میں سے صرف چھ عورتیں ہیں۔ امریکہ میں سب سے بڑے سائنسی ادارے نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے منتخب ممبران میں عورتوں کی تعداد ڈیڑھ فیصد سے زیادہ نہیں۔ اور تو اور کسی ترقی یافتہ ملک میں بھی زچگی کی ماہرین ڈاکٹر خواتین کی تعداد بھی اس ملک کی ضرورت کے مطابق نہیں بلکہ مرد ماہر ڈاکٹروں کو یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

اگر ان تمام تصریحات کے باوجود کوئی شخص اس بات پر مصر ہو کہ عورت اور مرد میں کامل مساوات اور برابر کی صلاحیتیں ہیں اور عورت کو بیرونِ خانہ کے پر مشقت کاموں میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہئے تو یہ اس کی خود فریبی ہے یا پھر اسے ذہنی اور فکری انتشار کا عارضہ لاحق ہے۔

بقیہ: ناموں کو بگاڑنے کا غلط رواج

اپنے غیر مسلم دوست کو بے تکلفی میں "اوبندا" کہہ کر مخاطب کیا۔ سید صاحب نے انہیں ٹوکا کہ یہ کیا تہذیب ہے؟ وہ بولے کہ یہ غیر مسلم ہیں۔ فرمایا "تم تو مسلمان ہو۔"

اسلامی تہذیب کا بنیادی سبق

اسلامی اخلاق کے مکمل دستور (سورۃ الحجرات) میں ہدایت کی گئی ہے:

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ

"لوگو! ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو ایمان لانے کے بعد کسی شخص کو (پہلے) گناہ کے نام سے یاد کرنا برا ہے۔"

خودی اور فلسفۂ سیاست (۵)

اقبال کا سیاسی مسلک

چونکہ خدا کے تصوّر پر قائم ہونے والی ریاست انسان کے لیے ہر قسم کی برکتوں اور نعمتوں کا باعث ہوتی ہے اور غلط اور ناقص تصوّر پر قائم ہونے والی ریاست اُس کے لیے ہر قسم کی مصیبتوں اور بدبختیوں کا سبب بنتی ہے، اقبال نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ ریاست کسی غلط نصب العین پر نہیں بلکہ خدا کے صحیح نصب العین پر قائم ہونی چاہیے۔ سچّا حکمران خدا ہی ہے، اُس کے علاوہ جس قدر تصوّرات ریاستوں کی بنیاد بنائے جاتے ہیں وہ جھوٹے خداؤں یا بتوں کی طرح ہیں جن کی طرف ان کے چاہنے والے خدا کی صفات غلط طور پر منسوب کرتے ہیں، تاکہ اُن کی ستائش اور پرستش کر سکیں اور اُن کی ناپاک چوکھٹ پر اپنی عملی سیاسی زندگی کی تقدیس کو قربان کر سکیں۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

اقبال "الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" میں لکھتا ہے:

"ایک سیاسی نظام کے طور پر اسلام سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ توحید کے اصول کو نوعِ انسانی کی عملی اور جذباتی زندگی کے اندر ایک زندہ قوت بنانے کی عملی تدبیر ہے۔ اُس کا مطالبہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے، نہ کہ کسی تخت یا تاج کی، اور چونکہ خدا ہی زندگی کی آخری روحانی بنیاد ہے، لہٰذا عملی طور پر خدا کی اطاعت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود اپنی ہی فطرت کے بلند ترین تقاضوں کی اطاعت کرتا ہے۔"

نظریۂ وطنیت کے خطرناک نتائج

خاص جغرافیائی حدود کے اندر ایک خاص خطۂ زمین یا ملک کے رہنے والے لوگ' جن میں بالعموم ملک کے علاوہ زبان' نسل اور رنگ کا اشتراک بھی موجود ہوتا ہے' اور جو اپنے آپ کو ان اوصاف کے اشتراک کی بنا پر دوسروں سے الگ ایک گروہ یا جماعت تصور کرتے ہیں' ایک قوم کہلاتے ہیں اور وہ خطۂ زمین جس میں وہ رہتے ہیں اُن کا وطن کہلاتا ہے۔ ایسے لوگ اگر انبیاء کی ہدایت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے خدا کی معرفت اور محبت سے بے نصیب ہوں تو اپنے ان ظاہری مشترکہ اوصاف کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اپنی زندگی کے جس مرحلہ پر بھی وہ منظم ہو کر ایک ریاست کی صورت میں آتے ہیں وہ اپنی ریاست کا نصب العین اپنی قومیت یا وطنیت ہی کے تصور کو بناتے ہیں' جس میں وہ اپنی خاص نسل اور زبان اور اپنے خاص رنگ اور جغرافیائی امتیازات کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ اس زمانہ میں خدا کی جگہ لینے والے تمام غلط اور ناقص سیاسی نظریات میں سب سے زیادہ رواج پانے والے اور سب سے زیادہ پست اور رجعت پسندانہ اور نوعِ انسانی کے لیے سب سے زیادہ ضرر رسان نظریات میں سے ایک قومیت یا وطنیت کا نظریہ ہے۔ یہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی ہے کہ اس وقت دنیا کی بیشتر ریاستیں اپنی اپنی وطنیت یا قومیت کے نصب العینوں پر قائم ہیں مثلاً انگریزی قومیت یا وطنیت انگلستانی ریاست کا' فرانسیسی قومیت فرانسیسی ریاست کا' اطالوی قومیت اطالوی ریاست کا' امریکی قومیت امریکی ریاست کا اور ہندوستانی قومیت ہندوستانی ریاست کا نصب العین ہے۔

نظریۂ وطنیت کی بنیاد یہ عقیدہ ہے جو سب سے پہلے عیسائی مغرب کے نام نہاد مہذب لوگوں نے ایجاد کیا تھا اور اب پوری دنیا میں پھیل گیا ہے کہ سیاست کو مذہب سے الگ رہنا چاہیے۔ اقبال اس دور کا پہلا مفکر ہے جس نے بڑی شدت کے ساتھ نظریۂ وطنیت کی بنیاد یعنی مذہب اور سیاست کی دوئی کی مخالفت کی ہے' اُس کے نقصانات کو واضح کیا ہے اور اُس کی نامعقولیت کا پردہ چاک کیا ہے۔ اقبال نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دوئی کا اصول نوعِ انسانی کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ دوئی ملک اور مذہب دونوں کی ناکامی اور نامرادی کا سبب ہوتی ہے' کیونکہ ایک تو یہ انسانوں

کے قومی اور بین الاقوامی اخلاق کو بگاڑتی ہے اور دوسرے وحدتِ انسانیت کو پارہ پارہ کر کے تباہ کن بین الاقوامی جنگوں کا باعث بنتی ہے۔ دورِ حاضر کی عیسائی تہذیب اگر اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ نہیں تو یہ اس کا اندھاپن ہے۔ نوعِ انسانی کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ روحانیت (جنیدی) اور سلطنت (اردشیری) آپس میں مل جائیں۔

دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جُنیدی و اردشیری!

نظریۂ وطنیت مروّجہ عیسائیت کی پیداوار ہے

عیسائیت کے مزاج کی وجہ سے ضروری تھا کہ مغرب کی عیسائی دنیا آخر کار مذہب کو سیاست سے الگ کر دے۔ عیسائیت دنیا کو ترک کرنے، رہبانیت اختیار کرنے اور غاروں میں گھس کر خدا کی عبادت کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ سیاست کے لیے جو بلاشبہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے، عیسائیت کے نظریۂ انسان و کائنات میں یا اُس کے بانی کی عملی زندگی میں کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ انسان کی پوری عملی زندگی کی راہ نمائی کے لیے اپنی عملی زندگی کو ایک نمونہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے نہیں آتے تھے، بلکہ اُن کی تعلیم کا مدّعا یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی مذہبی زندگی میں ریاکاری اور نافرمانی کے جو عناصر پیدا ہو گئے ہیں اُن کی بجائے اخلاص اور یقین کے اوصاف پیدا کیے جائیں۔ عیسائیت کے علماء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کا مشن یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی تعلیمات سے کسی قوم کو یا کسی بر تر قسم کی قوم کو دنیاوی اور مادی طور پر عظمت سے ہم کنار کریں۔ یہی سبب ہے کہ جب لوگوں نے اُن کو اپنا بادشاہ بنانا چاہا تو وہ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ سیاست اور جنگ کے سمیت انسان کی پوری عملی زندگی کی راہ نمائی کے لیے ایک مثال یا نمونہ پیش کرنا رحمۃ للعلمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام تھا جو آپ کے بعد آنے والے تھے۔

حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ایک صحابیہ — ایک نامور شاعرہ (۲)

—— از: پروفیسر سلیم الرحمٰن ——

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خنساءؓ کے درد انگیز اشعار سن کر افسردہ ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت خنساءؓ کے مرثیوں کے اس فکری پہلو کے علاوہ شاعرہ کی زبان دانی، لسانی ادراک اور فنی پہلوؤں کو بھی آنحضرتؐ خوب محسوس فرمایا کرتے تھے۔ ان واقعات اور داد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبان دانی، فنی عظمت اور فکر و فن کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی زبان کی بلاغت کے سلسلے میں بذاتِ خود ایک اتھارٹی ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آنحضورؐ کی ابتدائی پرورش ایک ایسے قبیلے میں ہوئی تھی جو اپنی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت میں بے عدیل تھا۔ اسی قبیلے کی فصاحت و بلاغت اور اس سے اپنے بچپن کی نسبت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخر بھی فرمایا کرتے تھے۔ شبلی نعمانی کی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جلد اوّل میں حضورؐ کی تاریخِ ولادت کے تذکرے کے بعد رضاعت کے عنوان میں لکھتے ہیں:۔

"ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے۔ ابن سعدؓ نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے۔" بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلے کو کہتے ہیں۔"

کتنی خوش بخت تھیں حضرت خنساءؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہ جن کے درد انگیز مرثیوں کو الہامی فصاحت اور روحانی بلاغت رکھنے والے صاحب الجمال، سیّد البشرؐ کی سماعت اور داد و تحسین نصیب ہوئی۔

شاعرہ کے چھوٹے بھائی معاویہ کا قتل ہی فی الحقیقت اُن کی مرثیہ گوئی کی بنیاد بنا۔ پھر جب صخر اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو اُس کی آنکھوں سے نہ رُکنے والے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ اِدھر اُن کے دُکھی دل سے مرثیوں کے اکھوے اُبل پڑے۔ بھائیوں کی موت کے اس سانحے سے قبل وہ بہت قلیل تعداد میں شعر کہا کرتی تھیں اور اُن اشعار کے موضوعات زیادہ تر خاندانی وجاہت اور اظہارِ فخر پر مبنی ہوتے تھے۔ خنساءؓ کے معاصرین میں تین نمایاں شعراء ایسے تھے، جنہوں نے شخصی مرثیے لکھے۔ دُرید بن الصمۃ، ذوالاصبع عدوانی اور لبید بن ربیعہ۔ ان میں دُرید بن الصمۃ تاحیات اپنے بھائی کے قتل پر مرثیہ گوئی کرتا رہا۔ مگر یہ تینوں مذکورہ شعراء مرثیہ کہنے میں خنساءؓ کے پایہ کو نہ پہنچ سکے۔ دُرید کے بعض مرثیے مؤخرالذکر دونوں شعراء کی نسبت زیادہ اثرانگیز ہیں۔ یہی وہ شاعر ہے جو اپنی شہسواری، جنگجوئی اور سخن وری میں یگانۂ روزگار تھا۔ اسی نامور سخن ور نے عہدِ شباب میں خنساءؓ (اُس وقت شاعرہ مشرف بہ اسلام نہ تھیں) کو پیغامِ تزویج بھیجا تھا جسے شاعرہ نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا تھا کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے متعلق کسی بھی دوسرے قبیلے کے سردار کو اپنے خاندان اور قبیلے کے افراد پر ہرگز ترجیح نہیں دے گی۔ شاعرہ نے عملاً بھی اپنے اس عہد کو نبھایا اور اپنے ہی قبیلے کے ایک معزز شخص سے اپنا رشتۂ ازدواج منسلک کیا۔ جب اپنے جواں سال بھائیوں کی موت پر حضرت خنساءؓ نے نہایت دردانگیز مرثیے کہے تو اُن کے معاصرین شعراء (خصوصاً زمانی اعتبار سے کچھ سینئر) اُن کے فن کے اور زیادہ قائل ہو گئے۔ ان میں دُرید سرِفہرست تھا۔ نابغہ، جریر اور لبشار تو خنساءؓ کے بے مثل مراثی کی بنا پر انہیں بہت سے مرد معاصرین پر فوقیت بھی دیتے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ شخصی مرثیوں میں بھائی کا رشتہ پوری عربی شاعری میں باکمال مرثیے تخلیق کرواتا ہُوا نظر آتا ہے۔ حضرت خنساءؓ نے شخصی مرثیے اپنے بھائیوں کے مرگِ ناگہانی کے حوالے سے لکھے اور ادھر کئی صدیوں کے بعد فارسی ادب میں

عہدِ صفوی کا سب سے بڑا مرثیہ گو محتشم کاشی یا محتشم کاشانی بھی بھائی ہی کے مرنے پر شخصی مرثیہ تخلیق کرتا ہے۔ یہ صدمۂ زعاف بعد کو ایک وسیع کینوس اختیار کر جاتا ہے اور بیرونی و سیاسی صورتِ حال کے توسط سے رفتہ رفتہ شہدائے کربلا کے شاہکار مرثیوں پر منتج ہوتا ہے۔

حضرت خنساء رضؓ نے بھائیوں کی موت پر جو ناقابلِ فراموش مرثیے لکھے اس نے لوگوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جیسی عالمہ و فاضلہ بھی خنساء رضؓ کے حزن و ملال کی قائل ہو گئی تھیں اور زیرِ موضوع شاعرہ کے زورِ کلام اور اشعار میں موجود حد درجے کے سوز و گداز اور رقت انگیز خیالات و اسلوب نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے سخت طبیعت اور جلیل القدر صحابی رضؓ تک کے دل کو پسیج کر رکھ دیا تھا۔

جناب محمد کاظم اپنے مضمون "ایک جاہلی مرثیہ پڑھ کر" میں رقم طراز ہیں:

"اس کو اخیر زمانے میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس حال میں دیکھا تھا کہ اس کا سر گٹھا ہوا تھا، آنکھیں رو رو کر سفید ہو گئی تھیں اور وہ ایک لاٹھی کا سہارا لے کر چلتی تھی۔ صخر کی موت نے اس عورت کو ایک پُرگو اور پُراثر شاعرہ بنا دیا۔ اور اس کے مرثیوں کی صدا اطراف و جوانب میں گونجنے لگی۔ ایک مرتبہ جب عکاظ کے مشاعرے میں اس غم زدہ نے اپنا ایک مرثیہ پڑھ کر سنایا تو سُننے والوں کے دل دہلا ڈالے۔ عرب کا جہاں دیدہ شاعر اور نقاد نابغہ جو اس سال مشاعرے کا صدر تھا، خنساء رضؓ کا کلام سن کر کہنے لگا "اے دخترِ عرب! اگر تجھ سے پہلے اعشیٰ اپنا کلام نہ سنا چکا ہوتا تو میں تمہیں جن و انس کی سب سے بڑی شاعرہ قرار دیتا۔"

آپ نے ان سطور میں نابغہ ذبیانی جیسے فطین نقاد اور باکمال شاعر کا خنساء کے کلام پر تبصرہ ملاحظہ فرمایا۔ بنو امیہ کے زمانے کا نام ور اور کسی حد تک زبان دراز شاعر حرر

تو اس کے فن کا اس قدر مداح تھا کہ جب اُس سے کسی نے پوچھا "تمہارے نزدیک عرب کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟" تو اُس نے بے ساختہ جواب دیا: "اگر وہ خنساء نہ گزر چکی ہوتی تو میں کہتا جریر"۔ حضرت خنساءؓ سے متعلق ایک دلچسپ اور عجیب روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کی موت کے بعد سر پر ماتمی لباس کی علامت کے طور پر سیاہ رنگ کی چادر مستقل طور پر لے لی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اپنے آخری ایام میں بظاہر انہوں نے رونا دھونا اور گریہ وزاری بہت کم کر دی تھی مگر وہ کالی چادر تا دمِ مرگ اپنے ساتھ لگائے رکھی۔ حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ اس سیاہ چادر پر ماتمی لباس اور اسلام کی ممانعت کے حوالے سے تنقید بھی کی مگر اُس بلیغ اشعار کہنے والی بے عدیل شاعرہ نے کچھ اس انداز سے اپنی بلاغت آمیز گفتگو کی اور ایسا شاعرانہ نکتہ نکال کر دلائل دیئے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ جیسی فطین عالمہ لاجواب ہو گئیں بلکہ خنساءؓ کے سوگ اور گریہ وزاری کے جواز کی قائل بھی ہو گئیں۔

اسی سیاہ پوش اور سراپا ماتم شاعرہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فلا واللہ لا انساک حتّٰی
افارق مهجتی ویشق رمسی
فقد ودعت یوم فراق صخر
ابی حسّان لذاتی و اُنسی
فیا لهفی علیه و لهف اُمّی!
اُیصبح فی الضریح وفیه؟ یمسی

ترجمہ: "خدا کی قسم! جب تک جسم میں جان ہے اور جب تک میری اپنی قبر نہیں کھود دی جاتی میں ہر تمہاری یاد سے غافل نہیں ہوں گی۔ میں نے صخر کے وداع کے دن سے زندگی کی تمام لذتوں اور دلچسپیوں سے کنارہ کر لیا ہے اور ہائے افسوس! میرے بھائی پر وائے افسوس! کیا اُس کی صبح بھی اور شام بھی اب قبر کے اندھیرے غار میں ہُوا کرے گی؟"

واقعی قبر کے اندھیرے غار اور کسی عزیز کے اس غار میں چلے جانے کے تصور ہی سے دل کانپ اُٹھتا ہے۔ خنساءؓ کے مراثی میں بُکاء، فراق اور آنکھوں کے نمناک رہنے کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ آنکھوں کے کرب کو حضرت خنساءؓ نے بالخصوص ایک تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ اپنے مرثیوں میں بارہا اپنی آنکھوں سے خطاب کرتی ہیں، کبھی اس تخاطب میں اُن کی روانی پر دُکھ بھری حیرت کا اظہار کرتی ہیں اور کبھی عارضی طور پر آنسوؤں کا رُک جانا اُنہیں بڑی ناگوار گزرتا ہے اور وہ اُن کو اپنے بھائی کی صفات و خصائل یاد دلا کر انہیں رونے کی طرف مائل کرتی ہیں۔ صخر کے مرثیے میں وہ اپنی آنکھوں سے تخاطب کی وساطت سے کیوں آہ و بُکا کرتی ہیں:

اعینیّ جودا ولا تجمدا!
ألا تبکیان لصخر الندی؟
ألا تبکیان الجریء الجمیل
ألا تبکیان الفتی السیّدا
رفیع العماد، طویل النجا
د، ساد عشیرته امردا

ترجمہ: "اے مری آنکھوں خوب آنسو بہاؤ اور خشک نہ ہو جاؤ، کیا مجسمۂ جود و سخا صخر کے لیے تم آنسو نہیں بہاؤ گی؟ کیا اُس نوجوان سردار پر تم نہیں روتیں جس کے خیمے کے ستون بلند تھے۔ قد آور ہونے کی وجہ سے، جس کی تلوار کا پرتلہ لمبا تھا، اور جو داڑھی نکلنے سے پیشتر ہی نوجوانی میں اپنی قوم کا سردار بن چکا تھا۔"

مرثیے کے ان اشعار کی ابتداء میں آنسوؤں سے تخاطب ایک معصومانہ بے بسی کا نقشہ ہے جس سے مرثیے کے پُرگداز تاثر میں اضافہ ہو رہا ہے، بعینہٖ استفہام کے انداز میں بھی ایک مخصوص بے کسی ٹپک رہی ہے، پھر "ألا تبکیان"

اس استفسار کی صوتی تکرار اور مغموم آہنگ نے فنی طور پر اس مرثیے کو نکھار دیا ہے۔ اس بے بسی اور بے کسی سے بھرپور استفسار میں معنوی حُسن یہ ہے کہ شاعرہ کی آنکھیں رو رو کر خشک ہوتی جا رہی ہیں اور اصولِ نفسیات اور آنسوؤں کی آمد کا ایک نفسیاتی اور طبی حربہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی سوچ میں کسی عزیز شخصیت خصوصی طور پر وہ جو ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکی ہے اُس کے بارے میں اُس کی خوبیاں، صفات معاً اُس پر بیتنے والی تکالیف کے حوالے سے ارتکازِ فکر سے کام لے (یہاں ارتکازِ فکر سے مراد کوئی فلسفہ یا نظریہ نہیں بلکہ ایک بھرپور محویت سے اُسے یاد کرنا مراد ہے) تو آنسو طبی و نفسیاتی اصول کے تحت کچھ وقفے کے بعد پھر رواں ہو جاتے ہیں۔ شاعرہ کو اسی درمیانی وقفے نے ارتکاز و استفسار کا موقع فراہم کیا ہے جسے شاعرہ نے فنی طور پر مصرعے میں سمو کر امر کر دیا ہے۔

معاویہ کی موت پر خنساءؓ کا ایک بے مثل شعر ملاحظہ ہو جس میں مصرع ثانی کا صوتی آہنگ فنی و لسانی حُسن کا منہ بولتا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔

خنساءؓ کہتی ہیں ؎

فخر الشوامخ من قتلہٖ
وزلت الارض زلزالھا

ترجمہ: "معاویہ کی موت سے یوں لگتا ہے جیسے کہسار اوندھے منہ گر پڑے ہوں اور زمین کو ایک زلزلے نے آلیا ہو۔"

زیرِ بحث شاعرہ کے سینئر معاصرین اور قدرے جونیئر ہمعصروں (ناقدین و شعراء) کی تنقید، تبصرے و آراء کی روشنی میں ہم حضرت خنساءؓ کو بلاشبہ عہدِ جاہلیت کی صفِ اوّل اور مخضرم شعراء کے عہد کی بہترین شاعرہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اُلا یا صخرا ان ابکیت عینی
فقد اضحکتنی دھرا طویلا

دفعت بك الخطوب وانت حیّ
فمن ذا یدفع الخطب الجلیلا؟
اذا تبع البکاء علی قتیل
رأیت لکاءك الحسن الجمیلا

ترجمہ: " اے صخر! اگر میری آنکھوں کو تم رُلا رہے ہو تو طویل زمانے تک تم نے مجھے ہنسایا بھی تھا۔ جب تم زندہ تھے تو میں اپنی مصیبتیں تمہارے ذریعے دُور کرتی تھی لیکن اب اس بڑی مصیبت کو کون دُور کرے گا؟ جب کسی مقتول پر رونا بُرا مانا جائے اُس وقت بھی تجھ پر رونا اچھا اور پیارا کام تصور کروں گی۔"

صخر پر لکھے گئے اِس مرثیے کو میں ذاتی طور پر حضرت خنساءؓ کے شاہکار مرثیوں میں شمار کرتا ہوں اور بلاشبہ یہ ہے بھی ایک شاہکار تخلیق — اس میں مرثیے کی اصل روح جھلک رہی ہے اور شاعرہ نے غم و اَلم کے سمندر میں ڈوب کر مرثیے کی کنہ کو حاصل کیا ہے۔ ایک ایک مصرع ایک ایک لفظ سے شاعرہ کے باطنی کرب اور دلی ملال کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مصیبت زدہ بے سہارا بہن کی تمام تر نفسیات ان اشعار میں یوں بند ہے جیسے کوزے میں سمندر سمو گیا ہو۔ اُن دو مصرعوں پر مکرر غور فرمائیے کہ شاعرہ کی بے کسی کتنے عروج پر نظر آتی ہے۔ مصرع اولیٰ میں شاعرہ کی دنیاوی بے بسی اپنی انتہا پر ہے اور مصرع ثانی میں شاعرہ کی ذہنی اور قلبی بے بسی اپنے گداز آمیز ماحول کے لیے ایک کربناک فضا تیار کر رہی ہے جسے کوئی بھی صاحبِ دل محسوس کر کے تڑپ اُٹھتا ہے۔ وہ دونوں مذکورہ مصرعے یہ ہیں ؎ دفعت بك الخطوب وانت حیّ
فمن ذا یدفع الخطب الجلیلا؟

ترجمہ مکرر تحریر کر رہا ہوں:-

" جب تم زندہ تھے تو میں اپنی مصیبتیں تمہارے ذریعے سے دُور

کرتی تھی لیکن اب اس بڑی مصیبت کو کون دُور کرے گا۔"

ع فمن ذا یدفع الخطب الجلیلا؟

اِس انتہائی دُکھ بھرے استفسار (اور وہ بھی ایک دُکھی بہن کی زبان سے کیے جانے والے سوال) پر دل خود بخود ملول و مغموم ہو جاتا ہے۔ بھائی کی جواں مرگی پر جذباتِ خواہر کی ایسی عکاسی پوری عربی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔ درد کی فصیلوں میں مقید شاعرہ کی یہ آواز واقعی دل دہلا دینے والی ہے۔ جُدائی اور کبھی نہ ختم ہونے والی جُدائی کو "الخطب الجلیلا" کہہ کر اس کی معنویت کو شاعرہ نے مزید بلیغ کر دیا ہے۔۔۔ حضرت خنساءؓ نے ۲۴ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور بادیہ میں مدفون ہوئیں۔ ۸ھ میں اپنے پورے قبیلے سمیت جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر مشرّف بہ اسلام ہوئیں اور یوں ایک نغز گو اور بلند پایہ مرثیہ گو شاعرہ ایک جلیل القدر صحابیہؓ بن گئیں۔ اُن کی اسلامی زندگی تقریباً سولہ سالہ عرصے پر محیط ہے۔ اگرچہ انہوں نے مشرّف بہ اسلام ہونے کے بعد بھی بوساطت مراثی نوحہ و بَین جاری رکھا مگر چند برس کے بعد اُن کے الم پسند مزاج اور مغموم میلان میں ایک عجیب و غریب اور قابلِ ذکر تبدیلی آئی۔ اُن کا نوحہ و گریہ پسند مزاج صبر و تحمل میں تبدیل ہو گیا۔۔ بھائیوں کی جواں مرگی پر شاہکار مرثیے تخلیق کرنے والی بے مثل شاعرہ نے عہدِ فاروقی میں جنگِ قادسیہ کے لیے اپنے چار جوان بیٹوں کو جنگ میں لڑنے کے لیے آمادہ کیا۔ بھائیوں کی مرگ پر اپنی سخن وری کے ذریعے کربناک شور و غوغا بلند کرنے والی اس شاعرہ کو جب چاروں بیٹوں کے قتل ہو جانے کی خبر ملتی ہے تو وہ غیر متوقع طور پر نہایت صبر و سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہی ہیں" خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی اور میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے اُن سے ملا دے گا۔"

حضرت خنساءؓ کی شخصیت و مزاج میں اس تضاد پر مؤرخین و محققین کا کوئی تبصرہ نہیں ملتا۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خنساءؓ کو" اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"

کا ادراک ہو چکا ہوگا۔ ۔ ۔ (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب)

بہر حال یہ تو اُن کی طویل زندگی کے آخری سالوں کا ذکر ہے لیکن اگر ہم اُنہیں عربی شعر و ادب کی دنیا میں بطور شاعرہ دیکھیں تو سخن وری کی اس دنیا میں داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساڑھے چودہ سو برس قبل کی شاعرہ اپنے دُکھوں کی بارش میں سر پر غموں کی اوڑھنی ڈالے بے کسی کی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آج بھی اپنے قارئین کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے جواں مرگ بھائیوں کے لیے بَین کر رہی ہے۔ یہ اُس زوال کوزہ پشت، محرومِ بینائی ضعیفہ کے فکر و فن اور دل کرب کی صداقت کا ہی کمال تھا کہ ان کے دل گداز اور درد انگیز کلام کو سُن کر جاہلی عربوں کے بڑے بڑے بربریت پسند، کھٹور اور سنگ دل سرداروں اور سخت گیر لوگوں کے پتّے پانی ہو جایا کرتے تھے۔ بعد کو اسلامی عہد میں حضرت خنساءؓ کو جناب رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی داد و تحسین میسّر آئی۔ بڑے بڑے جیّد صحابہؓ اور امہات المومنین رضؓ اُن کے فن اور اثر انگیزی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ جاہلیت اور ظہورِ اسلام ہر دو زمانوں میں حضرت خنساءؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فصیح و بلیغ سخن وری سے بڑے بڑے جیّد اور اجلّ شعراء پنبہ دہن جایا کرتے تھے۔

بقیہ: حرف اول

ڈاکٹر محمد اقبال صافی صاحب نے اپنے اپنے علاقے کی انجمنوں کی کارکردگی کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ آخر میں صدر موسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو دعوت خطاب دی گئی۔ صدر موسس نے اپنے مختصر خطاب میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے مسرت و اطمینان کا اظہار کیا کہ "رجوع الی القرآن" کی یہ تحریک اب نہ صرف یہ کہ جڑ پکڑ چکی ہے بلکہ اس کام کی وسعت اور پھیلاؤ میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے بالخصوص ماہ رمضان المبارک کے دوران پاکستان کے متعدد شہروں میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگراموں کے انعقاد کا ذکر کیا اور فرمایا کہ لاہور اور کراچی میں متعدد مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کا ہونا نہایت خوش آئند ہے اور بلاشبہ اس چیز کو رجوع الی القرآن کی دعوت میں نمایاں پیش رفت کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کراچی اور لاہور کے علاوہ فیصل آباد اور ملتان میں بھی اس سال دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام منعقد ہوئے۔ نماز عشاء پر یہ اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا۔ ○○

لغات واعرابِ قرآن (۴۱)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۲۷)

آیات ۳۸ — ۳۹

(گزشتہ سے پیوستہ)

> ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ' الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱' الاعراب کے لیے ۲' الرسم کے لیے ۳' اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ا کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۲۷ : ۲ الإعراب

زیر مطالعہ آیات کو اعرابی لحاظ سے چار مستقل جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نیچے ہم ہر ایک حصے کو الگ الگ لکھ کر اس کے اعراب بیان کرتے ہیں۔

(۱) قلنا اھبطوا منھا جمیعاً

[قلنا] فعل ماضی معروف صیغہ جمع متکلم ہے جس میں ضمیر تعظیم "نحن" مستتر ہے جو اللہ تعالےٰ کے لئے ہے۔ [اھبطوا] فعل امر معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے اور اس ضمیر کی علامت

" اھبطوا " کی آخری واو (الجمع) ہے۔ یہ صیغۂ فعل پورا جملہ فعلیہ (فعل مع فاعل) بن کر فعل " قلنا " کا مقول (مفعول) ہو کر محلاً نصب میں ہے۔
[منھا] جار (من) اور مجرور (ھا) مل کر متعلق فعل (اھبطوا) ہیں
[جمیعًا] یہاں " اھبطوا " کی ضمیر فاعلین (انتم) کا حال ہے اس لیے منصوب ہے۔ علامت نصب تنوین نصب (ـً) ہے۔ یعنی "اترو تم سب اکٹھے ہوتے ہوئے" جس کا بامحاورہ ترجمہ "سب کے سب" ہے۔ دراصل یہاں " قلنا " کے بعد کا سارا جملہ (اھبطوا منھا جمیعًا) اس (قلنا) کا مقول (مفعول ہو کر محلاً منصوب ہے۔
(۲) فإما یأتینکم منی ھدی۔ فمن تبع ھدای ۔ فلا خوفٌ علیھم۔ ولا ھم یحزنون ۔
[فَ] عاطفہ ہے جو مابعد جملے کو ماقبل جملے سے مربوط کرتی ہے۔
[إمَّا] میں (جو دراصل إنْ + ما ہے) " إنْ " شرطیہ اور " مَا " زائدہ برائے تاکید ہے۔ بعض نحوی اس " إمَّا " کو " مُسَلِّطَة " بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ فعل پر نون التاکید مسلط کرتی ہے۔ قرآن کریم میں جہاں بھی یہ " إمَّا " (فإما یا د إمَّا کی شکل میں) آیا ہے اس کے بعد آنے والا فعل نون ثقیلہ کے ساتھ ہی آیا ہے ——— اردو میں اس کا ترجمہ صرف " تو " ہی سے کیا جاتا ہے۔
[یاتینکم] میں " یَأْتِیَنَّ " فعل مضارع مؤکد بنون ثقیلہ ہے (صیغہ واحد مذکر غائب) اور یہ " اِن " شرطیہ کی وجہ سے محلاً مجزوم ہے مگر " اِن " کے بعد " مَا " زائدہ مؤکدہ آنے اور آخر پر نون ثقیلہ لگنے سے اس (صیغۂ مضارع) میں ظاہرًا کوئی علامت جزم نہیں ہے۔ اور ضمیر منصوب [کم] یہاں اس فعل کا مفعول بہ ہے۔ [مِنِّی] یہ حرف الجر (مِن) اور مجرور " نی " (جو دراصل " ی " مع نون الوقایہ ہے) کا مرکب ہے (جب " مِنْ " کے بعد یائے متکلم (ی) آئے تو اس (ی) پر نونِ وقایہ ضرور لگتا ہے اور اسی لیے " شدّ " پیدا ہوتی ہے) یہ مرکب جاری (مِنّی) یہاں متعلق فعل (یاتینّ)

ہے ۔ یہاں " مِنْ " ابتدائیہ بھی ہو سکتا ہے جس کا ترجمہ " میری طرف سے " ہوگا اور یہ " مِنْ " بیانیہ بھی ہو سکتا ہے اس صورت میں (اور " مِنِّی " کی تقدیم یعنی "پہلے آنے" کی وجہ سے بھی) اس کا ترجمہ " میری ہی طرف سے " (کسی اور کی طرف سے نہیں) ہو سکتا ہے ۔ [هدى] فعل (یاتِیَنَّ) کا فاعل (لھذا) مرفوع ہے جس میں علامت رفع ظاہر نہیں ہوئی (اس لیے کہ یہ دراصل اسم مقصور ہی ہے) یہاں تک (فاما یاتینکم منی ھدی) جملہ کا پہلا حصہ (شرط) مکمل ہوتا ہے ۔ اس کے بعد

● [فَمَنْ] کی فاء (ف) رابطہ کے لئے ہے جو جوابِ شرط کے شروع میں آتی ہے ۔ اور " مَنْ " شرطیہ (موصولہ) ہے ۔ یہاں سے جملہ شرطیہ کے پہلے حصے (بیانِ شرط) یعنی (فاما یاتینکم ......) کا جوابِ شرط پھر ایک جملہ شرطیہ سے شروع ہوتا ہے اور " مَنْ " شرطیہ اس نئے (شرطیہ) جملے کے مبتدأ کا کام دے رہا ہے ۔ لہذا مرفوع ہے (اگرچہ مبنی ہونے کے باعث علامتِ رفع کے بغیر ہے) [تَبِعَ] فعل ماضی معروف مع ضمیر فاعل مستتر (ھُوَ) ہے جو مبتدأ (" من ") کے لیے ہے ۔ یہاں یہ فعل (تبع) محلاً مجزوم شمار ہوگا کیونکہ اسم شرط (مَنْ) کے بعد آیا ہے تاہم فعل ماضی ہونے کی وجہ سے اس (فعل) میں کوئی تغیر نہیں ہوا ۔ [ھدایَ] مضاف (ھدی ، ھدا) اور مضاف الیہ (ضمیر متکلم مجرور " ی ") مل کر فعل تبع کا مفعول بہ ہے اور یہ جملہ (فمن تبِعَ ھدایَ) اپنے سے پہلے جملے (فاما یاتینکم منی ھدًی) کا جوابِ شرط بھی ہے اور مابعد والے جملے کے لئے جملہ شرطیہ (کا بیانِ شرط والا حصہ) بھی ہے جس کا جواب

● [فلا] کی " فائے " رابطہ (برائے جواب شرط) سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد " لَا " نافیہ (بمعنی لَیْسَ = نہیں) ہے اور [خوفٌ] مبتدأ ہے جو نفی کے ذریعے عموم پیدا ہونے کی بنا پر نکرہ آیا ہے [1] [علیھِم]

(1 حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

جارّ (علی) اور مجرور (ھم) مل کر مبتدأ (خوف) کی محذوف خبر مرفوع (مثلاً موجودٌ، کائنٌ) کا قائم مقام ہے ___ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں "لَا" مشابہ "بِلَیْسَ" ہو اور "خوفٌ" کو اس کا اسم مرفوع اور "عَلَیْھِمْ" کو اس (لیس = لا) کی قائم مقام خبر یعنی محلاً منصوب سمجھا جائے۔ یہاں تک ایک جملہ اسمیہ (فلاخوفٌ علیھم) مکمل ہو کر سابقہ شرط (فمن تبع ھدایَ) کا جوابِ شرط بنتا ہے۔[۲]

● [وَلَا] اس "وَ" کے ذریعے اس "لَا" کا پہلے "لَا" (خوفٌ والے) پر عطف ہے اور [ھُمْ] ضمیر مرفوع منفصل یہاں مبتدأ کا کام دے رہی ہے اور دونوں جگہ (اوپر علیھم میں اور یہاں) جمع کی ضمیر (ھم) گزشتہ مبتدأ (مَنْ) کے بلحاظ معنی جمع ہونے کی بناء پر آئی ہے [یحزنون] فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعلین مستتر (ھم) پورا جملہ فعلیہ (فعل مع فاعل) ہو کر "ھم" کی خبر ہے یا چاہیں تو یہاں بھی "ھم" کو "لا" (مشابہ بلیس) کا اسم (مرفوع) سمجھ کر "یحزنون" کو اس کی خبر (لھذا محلاً منصوب) سمجھ لیں بمعنی "محزونین" سمجھ کر۔ اور یہاں بھی چونکہ

---

[۱] مبتدأ کے نکرہ آنے کی کچھ وجوہ یا شرائط ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نفی اس پر مقدم ہو (یعنی پہلے آئے) جس سے اس میں ایک عموم کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

[۲] عام عربی (غیر قرآن) میں اگر یہاں "لا" لنفی الجنس سمجھ کر "لاخوفَ علیھم" کہیں تو بلحاظ قواعدِ زبان درست ہوگا (بلکہ ایک آدھ خارج از سبعہ قراءت میں اس طرح پڑھا بھی گیا ہے) لائے نفی جنس سمجھا جائے تو مطلقاً ہر طرح کے خوف (دنیا کا ہو یا آخرت کا) کی نفی ہوتی۔ اب "خوفٌ" (نکرہ مرفوع) کے ذریعے بظاہر آخرت کے خوف کی نفی ہی سمجھی جاسکتی ہے کیونکہ دنیا میں ہر طرح اور ہر قسم کے خوف سے محفوظ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور تنکیر کی وجہ سے خوف سے مراد "بڑا خوف" اور "معمولی خوف (یعنی قلیل یا کثیر خوف) دونوں ہو سکتے ہیں۔

ایک تو " لا " کی تکرار ہے اور وہ مبتداء سے مقدم بھی ہے (یعنی یہ صرف فعل یحزنون کی نفی نہیں ورنہ " وھم لا یحزنون " ہوتا) لھذا اس (ولا ھم یحزنون) کا ترجمہ " اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے " سے کیا جانا چاہیئے مگر سوائے ایک دو کے کسی مترجم نے اس " ہی " کا خیال نہیں کیا۔ اس طرح یہ آخری دونوں جملے (فلاخوفٌ علیھم ــ ولاھم یحزنون) ایک جملہ شرطیہ کے پہلے حصے (فمن تبع ھدای) یعنی بیان شرط کا جواب شرط بھی ہے اور یہ اس " مَن " کی جو جملہ شرطیہ کا مبتدأ تھا، خبر بھی ہے۔

● قاعدہ یہ ہے کہ جب " مَن " (یا کوئی اسم شرط) مبتدأ ہو اور اس کے بعد کوئی مکمل جملہ فعلیہ آرہا ہو تو (بعض نحویوں کے نزدیک)

(۱) اس جملہ کو اس مبتدأ (مَنْ وغیرہ) کی خبر بھی قرار دیا جاسکتا ہے یعنی یہاں " تبع ھدایَ " " فَمَنْ " کے " مَنْ " کی خبر بھی ہوسکتا ہے۔

(۲) اور بعض کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ اس شرطیہ جملے کے جواب کو (جو یہاں "فلاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون" ہے) ہی اس " مَنْ " کی خبر سمجھا جائے۔

(۳) اور یہ بھی جائز ہے کہ جملہ شرطیہ یعنی بیان شرط (فمن تبع ھدای) اور جواب شرط (فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون) دونوں کو ملا کر اس " مَنْ " (مبتدأ) کی خبر قرار دیا جائے۔

بہر حال یہ سب " فنی " باتیں ہیں عملاً اردو ترجمہ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا سوائے اس کے کہ جملہ شرطیہ (شرط اور جواب شرط) میں استعمال ہونے والے صیغہ ہائے فعل ماضی کا ترجمہ فعل مستقبل میں کیا جائے گا۔

(۳) والذین کفروا وکذبوا بایتنا اولئک اصحب النار۔

[وَ] یہ واو عاطفہ ہے جس کے ذریعے اگلے " الذین " کو سابقہ جملہ شرطیہ کے مبتدأ (مَنْ) پر عطف کیا گیا ہے (یعنی مَنْ..... والذین.....)۔ یا یوں کہیئے کہ " الذین..... " سے شروع ہونے والے (اگلے) جملے کو

" فَمَن تبع ..... " سے شروع ہونے والے (پچھلے) جملے کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ گویا یہاں بھی شرط (فمن تبع.....) اور اس کے نتائج یا جوابِ شرط (فلا خوف.....) بیان کرنے کے بعد اب ایک طرح سے " و من لم یتبع هدای " کا انجام بتایا جا رہا ہے۔ مگر اس " عدم اتباع " کی شناعت اور قباحت کی شدت ظاہر کرنے کے لئے اسے " کفر " کہہ کر بیان کیا گیا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ [الذین] اسم موصول مبتدأ (محلاً مرفوع) ہے اور [کفروا] فعل ماضی معروف مع ضمیر فاعلین (ھم) جملہ فعلیہ بن کر " الذین " کا صلہ (یا اس کی ابتداء) ہے۔ [وَکذّبوا] کی واو عاطفہ ہے جس کے ذریعے مابعد فعل " کذبوا " کو (جو خود فعل ماضی مع ضمیر فاعلین (ھم) ہے) پہلے فعل (کفروا) پر عطف کیا گیا ہے یعنی یہ دونوں فعل بیانِ شرط کا حصہ ہیں۔ [بایاتنا] کی ابتدائی " باء (ب) " تو فعل " کذبوا " کا صلہ ہے جو اس کے مفعول " آیاتنا " (جو خود مضاف (آیات) اور مضاف الیہ (نا) سے مل کر بنا ہے) سے پہلے آیا ہے۔ اس طرح " بآیاتنا " محلاً منصوب ہے (اگرچہ لفظاً مجرور ہے) اس طرح " کفروا و کذبوا بآیاتنا " مل کر " الذین " کا صلہ مکمل ہوتا ہے اور یہ سارا صلہ موصول مل کر مبتدأ بھی ہے۔ (اور " مَنْ " پر عطف ہونے سے بیانِ شرط بھی ہے) جس کی خبر (یا جوابِ شرط) آگے دو جملے آ رہے ہیں پہلے (جواب شرط یا خبر والے) جملے کا مبتدأ [اولئکَ] ہے (لھذا محلاً مرفوع ہے اگرچہ مبنی ہونے کے باعث علامتِ رفع ظاہر نہیں ہے) اور [اصحاب النار] مضاف (اصحاب) اور مضاف الیہ (النار) مل کر پورا مرکب اضافی " اولئکَ " کی خبر ہے اسی لیے " اصحاب " مرفوع ہے علامتِ رفع آخری " ب " کا ضمہ (ـُ) ہے۔ یہ پورا جملہ (اولئکَ اصحاب النار) " الذین " اور اس کے صلہ (کفروا و کذبوا بآیاتنا) کی خبرِ اوّل بنتی ہے۔

(۴) هم فیها خلدون

[هم] ضمیر مرفوع منفصل مبتدأ ہے اور [فیها] جار (فی) مجرور (ها) مل کر آگے آنے والی خبر (خالدون) سے متعلق ہیں۔ [خالدون] "هُمْ" کی خبر (لھذا) مرفوع ہے علامتِ رفع آخری نون سے پہلے آنے والی واو قبل مرفوع (ـُـو) ہے۔ اس طرح یہ جملہ اسمیہ بھی "الذین" والے صلہ موصول (مبتدأ) کی دوسری خبر ہے یعنی پہلی خبر (اولئك اصحاب النار) کا تتمہ ہے۔ اور یہ جملہ (هم فیها خلدون) "اصحاب" یا "النار" کا حال بھی ہو سکتا ہے[1] یعنی "ان (اصحاب) کا یہ حال ہوگا کہ وہ اس آگ میں ہمیشہ رہیں گے" یا یہ کہ "اس آگ کا یہ حال ہوگا کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"، بامحاورہ ترجمہ کے لئے صرف "هم فیها خالدون" کا ترجمہ کافی ہے۔ "فیها" کی ضمیر مؤنث "ها" کا مرجع "النار" ہے جو مؤنث سماعی ہے۔

● اس جملے میں بھی عام نثر کے قاعدے کے مطابق متعلق خبر (فیها) کو خبر (خالدون) کے بعد ہونا چاہیئے تھا یعنی اصل عبارت "هم خالدون فیها" ہوتی۔ مگر "فیها" کی تقدیم سے ایک تو عبارت میں شعر جیسا حسن پیدا ہو گیا ہے اور ساتھ ہی معنی میں حصر کا مفہوم بھی آ گیا ہے۔ اب اس جملے کا ترجمہ "وہ اس میں ہی ہمیشہ رہنے والے ہوں گے" ہونا چاہیئے۔ اور "فیها" کی اس تقدیم کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس آخری جملے (هم فیها خالدون) کو "اصحاب" کی بجائے "النار" ہی کا حال سمجھا جائے۔ اس وجہ سے بھی ترجمہ "اسی میں" ہونا چاہیئے۔ اکثر مترجمین نے یہاں "فیها" کی تقدیم کے اس معنوی اثر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ غالباً صرف ایک مترجم (شاہ عبدالقادرؒ) نے یہاں "اسی میں" (یعنی اس ہی میں) کے ساتھ ترجمہ کیا ہے باقی سب نے "اس میں" کو ہی اختیار کیا ہے۔

---

[1] اس توجیہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے البیان (ابن الانباری) ج ۱ ص ۷۶۔

۲ : ۲۷ : ۳ الرسم

زیرِ مطالعہ دو آیات میں بھی بیشتر کلمات کا رسم عثمانی اور رسم املائی ایک جیسا ہے۔ صرف درج ذیل تین کلمات کا رسم مصحف عام املاء سے مختلف ہے ۔ یعنی " بایتنا، اصحب النار اور خلدون " ـــــ تفصیل یوں ہے :ـ

(۱) کلمہ " بایتنا " کا عام رسم املائی " بآیاتنا " ہے مگر رسم عثمانی کے مطابق قرآن کریم میں اسے یہاں ـــ اور قریباً ہر جگہ ـــــ " ی " کے بعد والے " الف " کے حذف کے ساتھ ـــ یعنی بایتنا " لکھا جاتا ہے ۔ لفظ " آیات " بصورت مفرد یا مرکب (مثلاً مضاف ہو کر) قرآن کریم میں کل ۲۹۵ جگہ آیا ہے ۔ یہ ہر جگہ بصورت " ایت " (یعنی الف سے ماقبل ھمزہ (ء) اور " ی " کے بعد والے الف کے حذف سے) لکھا جاتا ہے ماسوائے دو مقامات (یونس : ۱۵ و ۲۱) کے کہ وہاں اثبات الالف بعد الیاء کے ساتھ (ایاتنا) لکھا جاتا ہے [۱] البتہ بعض علماءِ رسم نے ایک تیسری جگہ (یوسف : ۷) میں بھی اثبات الف کا ذکر کیا ہے ۔ ان مواضع پر حسب موقع بات ہو گی ان شاء اللہ تعالیٰ ۔

(۲) اصحب النار : کا پہلا لفظ عام عربی املاء میں " اصحاب " لکھا جاتا ہے مگر قرآن کریم کے اندر یہ لفظ رسم عثمانی کے اتباع میں ہر جگہ (اور یہ لفظ قرآن میں مفرد مرکب مختلف صورتوں میں ۷۸ جگہ آیا ہے) " بحذف الالف بعد الحاء " (اصحب) لکھا جاتا ہے ۔ اس کو رسم املائی کے مطابق (اصحاب) لکھنا (جیسا کہ ترکی، ایران اور بعض دیگر ممالک میں رواج ہو گیا ہے) رسم عثمانی یا رسم المصحف کی خلاف ورزی ہے ۔

(۳) خلدون : کی عام املاء (برسم معتاد) " خالدون " ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ یہاں اور ہر جگہ (اور قرآن میں یہ لفظ بصورت واحد، تثنیہ اور جمع مختلف تراکیب میں قریباً ۷۵ جگہ آیا ہے) " بحذف الالف بعد الخاء " (خٰلِدًا، خٰلِدَیْنِ،

---

[۱] المقنع (للدانی) ص ۲۰ [۲] نثر المرجان ج ۱ ص ۱۳۴ ۔ سیر الطالبین ص ۲۶

خلدون وغیرہ) لکھا جاتا ہے۔ اور یہ بھی رسم عثمانی کا متفق علیہ مسئلہ ہے لهذا اسے باثبات الف رسم املائی کی طرح لکھنا (جیساکہ بعض ملکوں مثلاً ایران، ترکی وغیرہ میں رواج ہوگیا ہے) رسم قرآنی (عثمانی) کی خلاف ورزی ہے۔

۲:۲۷:۴ الضبط

زیرِ مطالعہ قطعہ آیات میں کلمات کے ضبط میں اختلاف کو کسی حد تک درج ذیل نمونوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ "کسی حد تک" ہم نے اس لیے کہا ہے کہ همزة الوصل اور همزة القطع کو بذریعہ ضبط ظاہر کرنے کے بعض اور طریقے بھی ہیں۔ جن میں سے ہم نے صرف ایک کے اختیار پر ہی اکتفا کیا ہے اور باقی کو بخوفِ طوالت نظر انداز کیا ہے۔ اس موضوع پر راقم الحروف کا ایک مفصل مقالہ "کتابتِ مصاحف اور علم الضبط" کے عنوان سے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد) کے سہ ماہی مجلہ "فکر و نظر" کی اشاعت محرم۔ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ (مطابق اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۷ء) میں (ص ۷۱ تا ۱۴۸) شائع ہوا تھا جس میں مختلف ملکوں کے مصاحف سے ضبط کے پندرہ (۱۵) نمونے (عکسی فوٹو) بھی شامل ہیں۔ شائقین تفصیل کے لیے اس مقالہ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

قُلْنَا، قُلْنَا، قُلْنَا / اهْبِطُوا، اهْبِطُوا، آهْبِطُوا
آهْبِطُوا / مِنْهَا، مِنْهَا، مِنْهَا / جَمِيعًا، جَمِيعًا،
جَمِيعاً، جَمِيعًا / فَإِمَّا، فَإِمَّا، فَإِمَّا، فَإِمَّا /
يَأْتِيَنَّكُمْ، يَأْتِيَنَّكُمْ، يَأْتِيَنَّكُمْ / مِنِّي،
مِنِّي، مِنِّي، مِنِّي / هُدًى، هُدًى، هُدًى / فَمَنْ،

فَمَنْ ، فَمَنِ / تَبِعَ ، تَبِعَ / هُدَایَ ، هُدَایَ ،
هُدَایَ / فَلَا ، فَلَا ، فَلَا / خَوْفٌ ، خَوْفٌ ، خَوْفٌ /
عَلَیْهِمْ ، عَلَیْهِمْ / وَلَا ، لَا ، لَا / هُمْ ، هُمْ /
یَحْزَنُوْنَ ، یَحْزَنُوْنَ ، یَحْزَنُوْنَ / وَالَّذِیْنَ ، اَلَّذِیْنَ
اَلَّذِیْنَ ، اَلَّذِیْنَ / كَفَرُوْا ، كَفَرُوْا ، كَفَرُوْا ،
كَفَرُوْا / وَكَذَّبُوْا ، كَذَّبُوْا ، كَذَّبُوْا ، كَذَّبُوْا /
بِاٰیٰتِنَا ، بِاٰیٰتِنَا ، بِاٰیٰتِنَا / اُولٰٓئِكَ ،
اُولٰٓئِكَ ، اُولٰٓئِكَ ، اُولٰٓئِكَ ، اُولٰٓئِكَ /
اَصْحٰبُ ، اَصْحٰبُ ، اَصْحٰبُ / النَّارِ ، النَّارِ ،
النَّارِ ، النَّارِ / هُمْ ، هُمْ / فِیْهَا ، فِیْهَا ،
فِیْهَا ، فِیْهَا / خٰلِدُوْنَ ، خٰلِدُوْنَ ،
خٰلِدُوْنَ ، خٰلِدُوْنَ -

توجّہ فرمائیے

تمام قارئین حضرات بالخصوص تنظیم کے رفقاء اور انجمن کے اراکین کی یاددہانی کے لیے عرض ہے کہ اپنے نام و پتہ کے لیبل پر درج زرِ تعاون ختم ہونے کی تاریخ کے مطابق آئندہ زرِ تعاون کی ادائیگی کا اہتمام جلد فرمایا کریں۔
یا کم از کم مطلع کر دیا کریں کہ پرچہ جاری رکھا جائے!

(سرکولیشن مینجر)

قصص القرآن

ایک تحقیقی مطالعہ

—— علامہ شبیر بخاری ——

عہد عتیق کی تہذیبی' تمدنی' معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں اساطیری اور دیومالائی داستانوں کا بڑا حصہ ہے اور اسی لئے Mythology تاریخ ارتقائے فکر انسانی کا ایک اہم شعبہ سمجھا جاتا ہے۔ Myths کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

> Myths are sacred narrations about the beings of the spiritual world and creation stories relating to the origin of the world of human beings and animals.
> (IAN CROFTON page 612)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا قابل تعریف اختصار کے ساتھ Myth کی یوں وضاحت کرتا ہے کہ:

> Myth is an imaginative expression of basic truth

یعنی Myth اساسی اور بنیادی صداقت کے تخیلاتی اظہار کا نام ہے۔ مصر' بابل' شام' چین' ہندوستان' یونان' روم وہ خطے ہیں جنہیں گہوارہ ہائے تہذیب انسانی (Cradles of Human History) کہا جاتا ہے اور ان ممالک کی ثقافتی روایات کے ہر دور میں انسانی سوچ پر روحانی تجربات کی چھاپ ملتی ہے۔

○ مصر کی آسمانی دیوی نُوط (Nut) کا زمینی دیوتا CEB پر غلبہ اور رے (سورج دیوتا) کا ان کے مابین سلسلۂ جنبانی اور رابطہ میسو پوٹیمیا میں سمیریوں اور سامیوں کے اساطیر جن میں ۱۲۰۰ ق م سے ۶۱۲ ق م میں زبان زد عوام قصوں میں اکیڈین کا EPIC.OF.GILGAMESH کا خاص مقام ہے۔ گلگامیش' میسوپوٹیمیا کے شہر اوروک (URUK) کا حکمران تھا۔ ایک شریر وحشی حکمران ان کیرو سے اس کی جنگ ہوئی اور اس معرکۂ خیر و شر میں گلگامیش غالب رہا۔ اور مآل کار ان کیرو' اس کا باج گذار' مطیع

اور دوست بن گیا۔ جنسی محبت کی دیوی اشطار کلامیش کو مغلوب کرنا چاہتی تھی' مگر اس نے اسے جھٹک کر کہا۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور وہ بے نیل مرام لوٹ گئی' اسے حیاتِ جاوید کی طلب کشاں کشاں اس دور کے ایک دانشور بزرگ اُتنا پشتم (UTNA PISHTAM) کے ہاں لے گئی لیکن اس کے ہاں اسے گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ پھر وہ شباب و قوت و اختیار کے دوام کے لئے طویل سفر پر روانہ ہوا۔ اور اسے اس دوران میں ایک ایسی بوٹی مل گئی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے کھانے کے بعد نہ آدمی مرسکتا ہے اور نہ محرومِ اقتدار ہوسکتا ہے لیکن مآل کار اسے دانشور اُتنا پشتم کے اس ناصحانہ قول نے فائدہ پہنچایا کہ انسان اگر اپنے فرائضِ منصبی کو دیانتداری اور محنت سے سرانجام دے تو وہ موت کے بعد حیاتِ جاوید پاسکتا ہے گویا

Only the actions of the just
Smell sweet and blossom in the dust
(J. Shirley 1595 - 1666)

○ ان عوامی اساطیر پر تنزیلاتِ ربّانی کا اثر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور چونکہ سچائی کی جستجو فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے اس لئے ایک آفاقی اخلاقی نظامِ رُشد و ہدایت ذہنوں پر مسلسل محیط ہوتا چلا گیا اور توحید' عملِ صالح اور یومِ آخرت پر عقائد کی پختگی اس کا منطقی نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس سرچشمۂ ہدایت کے فیوض کے قاسم انبیاء و رسل تھے' جو وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (المومن: ۱۳) اور اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۲۴) کے ارشادات کے مطابق ہر قوم اور ہر امت کے لئے مبعوث ہوئے۔ جارج سیل کی تحقیق کی رُو سے ان پر جو صحفِ مطہرہ نازل ہوئے ان کی تعداد ایک سو چار ہے (Th Koram page 79) -- اور ان کی تفصیل یوں ہے کہ دس صحیفے حضرت آدمؑ پر نازل ہوئے' پچاس صحیفے حضرت شعیبؑ پر' تیس حضرت ادریسؑ پر اور دس حضرت ابراہیمؑ پر۔ باقی چار کتابیں تھیں

1. Pentateuch
2. The Psalms
3. The Gospel
4. The Quraan

جو علی الترتیب حضرت موسیٰؑ' حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئیں اور قرآن مجید حضور سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ تاریخِ ادیانِ عالم اس عظیم المیے پر انگشت بدنداں ہے کہ قرآن مجید کے سوا ان صحفِ مطہرہ کی حفاظت نہ ہو سکی اور وہ زمانے کی دست برد کی نذر ہو گئے۔ اول الذکر ایک سو صحیفوں کے بارے میں تو محققین کی تحقیق بے نتیجہ ہے۔ البتہ زبور' تورات اور انجیل کے نسخے مہیا ہیں لیکن ان کا استناد محلِّ نظر ہے۔

تورات پندرہ سو ق م میں عبرانی زبان میں موجود تھی' ۲۸۴ ق م میں اس کا یونانی ترجمہ منظرِ عام پر آیا۔ اسے پانچ کتابوں میں پیدائش' خروج' احبار' گنتی اور استثناء کے عنوانات کے ماتحت ترتیب دیا گیا۔ ۷۹۸ ق م میں گم ہوئی' ۷۵ سال بعد دستیاب ہوئی' ۹۷۱ ق م میں میق شاہ مصر کے حملہ یروشلم کے موقعہ پر اور پھر چھ سو سال ق م میں بخت نصر کے دورِ جارحیت میں جلادی گئی۔ عزرا نبی نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر مرتب کی جو پھر پانچ حملوں میں ظالمانہ عصبیتوں کا نشانہ بنی۔ سنی سنائی روایات پر اسفارِ موسیٰؑ مرتب ہوئے' ان میں الحاقی حصہ غالب ہے۔ اسی طرح انجیل بلاشبہ حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی' ۳۴ نسخے نیقہ کونسل میں پیش کئے گئے' چار نسخے متی' مرقس' لوقا' حواری پال کے ۱۴ خطوط' پطرس' جان جوڈ کے مکتوبات اور یوحنا کے مکاشفات صحیح قرار پائے' باقی جعلی۔ ۳۲۵ عیسوی میں قسطنطین اعظم نے ۳۰۰ مقتدر پادریوں کی کونسل بنائی اور اصلی و نقلی نسخوں کی پہچان کا مآل کار یہ طریق کار اختیار کیا گیا کہ انہیں عشائے ربانی کی میز پر رکھ کر ہلایا گیا' جو نسخے نیچے گر گئے وہ الحاقی قرار پائے اور جو میز پر جمے رہے انہیں الہامی قرار دیا گیا۔

لیکن برخلاف ازاں قرآن مجید کا نزول لوحِ محفوظ سے ہوا' اس کی تنزیلات کا خطاب پوری عالمِ انسانیت سے ہے۔ یہ کتاب ریب و تاویل سے پاک ہے' یہ ہدیٰ اور فرقان کی بینات کی کتاب ہے (البقرہ : ۱۸۵)' اس کا نزول بالحق ہے (آل عمران : ۳)' یہ انباء الغیب کی ناشر ہے (آل عمران : ۴۴)' تورات و انجیل کی مصدق ہے' اہلِ تقویٰ کے لئے سرمایہ

موعظت ہے (المائدہ : ۴۸)' وحیِ تنذیر ہے (الانعام : ۱۹)' اس میں تنزیلاتِ مبارکہ ہیں (الانعام :۹۲) تمام الہامیات ماسبق کی تصدیق کرتی ہے اور الکتاب کی مفصل ہے (یونس : ۳۷)۔ اس کی مثل نہیں لائی جاسکتی (یونس : ۳۸)' دلوں کے امراض کی شفا ہے اور مومنین کے لئے ہدایت اور رحمت ہے (یونس :۵۷)۔ (یہ سرچشمۂ ہدایت) اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ ہے (ہود : ۱۴)' عقل و برہان کے لئے چیلنج ہے (یوسف : ۲)' ظلمت سے نور کی طرف رہنما ہے (ابراہیم :۱)' تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ اور مسلمانوں کے لئے ہدایت' رحمت اور بشارت کا پیغام ہے (النحل :۸۹)' بنی نوعِ انسان کے لئے تصریف الامثال ہے (بنی اسرائیل :۸۹)' خشیتِ الٰہی رکھنے والوں کے لئے تذکرہ ہے (طٰہٰ : ۲)' اس کی تنزیلات آیات بینات ہیں (النور : ۳۴)' یہ کتاب گنجینۂ حکمت ہے (یٰسٓ : ۲) اور اہلِ دانش کے لئے تذکر' تفکر اور تدبر کی دعوت ہے (ص : ۲۹)۔ یہ خدا ترسی میں احسن الحدیث ہے (الزمر : ۲۳)' لوحِ محفوظ کی یہ کتاب اعلیٰ ترین سطح کے شعورِ حکمت کی امین ہے (الزخرف : ۴)' یہ کتابِ مکنون ہے (الواقعہ : ۷۸)' سمجھنے سمجھانے میں سہل ہے (الدخان : ۵۸) اور یہ کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر : ۹) کہ ہم نے یہ (الذکر) خود نازل کیا ہے اور اس کی (پوری) محافظت کی ذمہ داری بھی ہم پر ہی ہے۔

آج عالمی بصیرت کو اعتراف ہے کہ قرآن مجید محفوظ ترین اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے (میور' پامر' آرنلڈ' پروفیسر ہٹی وغیرہ کے اعترافات ملاحظہ ہوں)۔ گویا بقولِ اقبال ؎

حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

چنانچہ قرآن مجید میں جو قصصِ موعظت وارشاد بیان کئے گئے ہیں ان کا تعلق بھی تاریخ انسانی کے انہی CRADLES OF CIVILISATION سے ہے جن کا اَسفارِ سابقہ میں ذکر ہوا' جن کی کما حقہ حفاظت نہ ہوسکی' اس لئے ان میں الحاقیات بھی ہیں اور تحریفات بھی' افسانویت بھی ہے اور مصنوعیت بھی۔ اور قرآن مجید کا ایک بڑا کارنامہ ان قِصص الانبیاء کو (علی الخصوص) دیومالائی بھول بھلیوں سے نکالنا اور اخلاق بیزار اثرات سے انہیں پاک کردینا ہے۔ تعلیمات قرآنی نے انبیاء و رسل کی پاکیزہ زندگیوں اور ان

کے نظامِ رشد و ہدایت کا پورا پورا تحفظ کیا' شکوک واہمات کے گرد وغبار سے انہیں صاف کیا' اور قصص الانبیاء کو اپنے صحیح صحتمندانہ پس منظر میں اس طرح پیش کیا کہ ان سے فکر و تدبرِ انسانی پر رشد و ہدایت رحمانی کی نئی نئی صبحیں طلوع ہوئیں۔

○ "قصہ" امام راغب اصفہانی کی تحقیق کی رو سے "تتبع الاثر" یعنی کسی کے یا اپنے ہی نقشِ قدم پر چلنے یا کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ام موسیٰؑ (غالباً نوخائیل) کے بارے میں قرآن مجید میں ہے کہ **قَالَتْ لِاُخْتِہٖ قُصِّیْہِ** (۱۱:۲۸) یعنی انکی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔ اسی طرح قصۂ خضرؑ و موسیٰؑ میں ہے کہ جب مجمع البحرین سے آگے جا کر حضرت موسیٰؑ اور ان کے خادم یوشع بن نون کو فراموش شدہ **مچھلی** یاد آئی تو **فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا** 'وہ دونوں اپنے اپنے قدموں کے نشانوں کے مطابق دوبارہ لوٹ کر گئے (۱۸ : ۶۴)۔ قصہ گوئی میں بھی ہم گذرے ہوئے واقعات و آثار کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں اور ان کی یاد تازہ کرتے ہیں' ان سے عبرت اور موعظت لیتے ہیں۔ اور قصص الانبیاء تو حکمت و دانش انسانی کا گنجینہ بے بہا ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا : **اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ** یہ تمام سچے قصے ہیں (۳ : ۶۱) اور **فِیْ قَصَصِھِمْ عِبْرَۃٌ** ان کے قصوں میں درس عبرت ہے (۱۲ : ۱۱۱)۔ قرآن مجید کی اٹھائیسویں سورت کا نام ہی "قصص" ہے۔ سورۂ یوسف کو "احسن القصص" فرمایا گیا ہے کہ اس میں انسانیت صالحہ کا ایک بلند کردار ابھرتا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور قصص الانبیاء پر نظر ڈالئے تو مندرجہ ذیل انبیاء و رسل کے احوال و قصص علی الخصوص ملتے ہیں: حضرت آدمؑ' حضرت نوحؑ' حضرت ادریسؑ' حضرت ہودؑ' حضرت صالحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت اسماعیلؑ' حضرت لوطؑ' حضرت یعقوبؑ' حضرت یوسفؑ' حضرت شعیبؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت ہارونؑ' حضرت الیاسؑ' حضرت الیسعؑ' حضرت داؤدؑ' حضرت سلیمانؑ' حضرت ایوبؑ' حضرت یونسؑ' حضرت ذوالکفلؑ' حضرت عزیرؑ' حضرت زکریاؑ' حضرت یحییٰؑ' حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ چونکہ رشد و ہدایت کا سلسلہ عالمگیر رہا ہے اس لئے ہر قوم اور ہر علاقے میں انبیاء مبعوث ہوئے' اس لئے یہ صراحت کردی گئی کہ **وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ** (النساء : ۱۶۴) کہ ایسے رُسُل بھی ہیں جن کے قصص ذکر کئے گئے ہیں اور ایسے بھی ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

○ دورِ حاضر کے ماہرین ارضیات و بشریات کے اندازے کے مطابق کرۂ ارضی کا حجم دو کھرب ساٹھ ارب کے لگ بھگ ہے۔ رقبہ ۱۹۶۹۳۷۴۰۰ مربع میل ہے جس میں سے ہائیڈرو سفیئر ۷۰ء۹۲ فیصد اور لیتھو سفیئر ۲۹ء۸ فیصد ہے۔ انسانی آبادی کا مجموعی طور پر شمار ۵۲۹۱ ملیون ہے۔ کائناتی بصیرت کا تقاضا ہے کہ نوعِ انسانی کی تخلیق کے مقاصد کی وضاحت' تبیان اور دائرۂ عمل کا تعین ہو اور اس کے لئے ایک باقاعدہ نظام ہدایت ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: **يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** (۳۵ : ۷) کہ اے اولادِ آدمؑ تمہاری جانب تمہی میں سے جب رسول آئیں جو میری جانب سے تمہیں نشانِ راہ دکھائیں تو ان کا تقویٰ اور اصلاح پر مبنی طرز عمل اگر اختیار کروگے تو خوف و حزن سے محفوظ رہوگے۔ پھر یہ نوید بھی ملی کہ: **لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ** (۷۷ : ۱۰) اور پھر یہ نظامِ رشد و ہدایت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا کہ **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا** (۵ : ۳) آج تمہارے دین کی تکمیل ہوگئی ہے' اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظیمہ (ہدایت) کا تم پر اتمام ہوگیا ہے اور رضاءِ الٰہی یہ ہے کہ تمہارا (عالمِ انسانیت کا) دین (نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات) اسلام ہو۔

○ تنزیلاتِ ربانی کا قرآن حکیم میں یہ مزاج ہے کہ پورا نظامِ ہدایت نافذ کرنے والے انبیاء و رُسل نیکوکار اور بلند کردار تھے۔ انہیں صالح' بشیر' نذیر' ہادی' امام' صادق' مصطفیٰ' مجتبیٰ' حنیف' موحد' اُولِی الاَیدِی وَالاَبصار اور مصطفین الاَخیار کہا گیا۔ اور پھر ایک ایک کا نام لے لے کر ان پر سلام بھیجا گیا ہے اور ساری کائناتِ ارضی کے انسانوں سے کہا گیا کہ **قَدْ كَانَتْ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** (الممتحنہ : ۶) ان کی زندگیاں تمہارے لئے **مینارۂ حسنات** ہیں' لیکن اسفارِ محرفہ میں سب سے زیادہ ظلم اسی تقدس مآب زمرۂ صالحین پر ہوا ہے' چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے دہنِ مبارک میں یہ ناشائستہ الفاظ ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا کہ:

> All those that have come in place of me are thieves and plunderers (Translation of the Holy Scripture, page 1165)

کہ ---- جتنے مجھ سے پہلے آئے سب کے سب چور اور ڈاکو ہیں (آئند کلام ص ۹۳)
قرآن حکیم کی رو سے انبیاء و رسل کی عظمت کا اقرار ایمانیات کا حصہ ہے اور وہ ان کی عفت فکر و عمل اور عصمتِ قلب و نگاہ کی شہادت دیتا ہے۔

○ قصص الانبیاء میں ہبوطِ آدم کا قصہ سب سے پہلا قصہ ہے۔ اسفارِ محرفہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں مندرجہ ذیل امور کی نشان دہی ہوتی ہے:

۱) خدا نے آدمؑ کی تخلیق کی' حوا حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کی گئی' شیطان نے سانپ کے ذریعے حوا تک رسائی کی۔

۲) حوا کی ترغیب پر حضرت آدم نے شجرِ ممنوعہ کھالیا۔ اور بتایا کہ یہ پھل خیر و شر میں تمیز سکھاتا ہے

۳) خدا اس حکم عدولی پر ناراض ہوا۔ سانپ کو سزا ملی کہ وہ عمر بھر زمین میں رینگے گا' مٹی کھائے گا' حوا کی اولاد سے اس کی دشمنی ہوگی۔ حوا سے کہا گیا کہ اس کے لئے یہ سزا ہے کہ وہ عمر بھر دکھ جھیلتی اور بچے جنتی رہے گی اور مرد اس پر غالب رہے گا۔ آدم سے کہا گیا کہ زمین ترے وجود سے ملعون ہوگئی ہے' تو زندگی بھر مشقت کی کڑیاں جھیل کر مرزوقاتِ حیات حاصل کرے گا۔

(۴) ہبوطِ آدم سے عدول حکمی کا گناہ اولادِ آدم کو ورثہ میں ملا اس لئے

"IN ADAM'S FALL WE SINNED ALL"

کا فلسفۂ فکر مرتب کیا گیا۔

قرآن مجید کے نزدیک اس تمام قصے میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت تکوینی کارفرما ہے۔ اس رب العالمین نے اپنے نظامِ ربوبیت کو برپا کرنے کے لئے خلقِ جدید کا ڈول ڈالا اور آدم نے اس گلشنِ تخلیق کے گلِ سرسبد کی حیثیت میں اس کی بہار آفریں متنوع رعنائیوں کے جلوے ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی میں اس خوبصورتی سے بکھیرے کہ کائنات ہی کا ذرہ ذرہ پکار اٹھا ؎ اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری!

ہبوطِ آدم میں مشیتِ ایزدی اور اللہ کی مصلحت تکوینی مضمر تھی۔ آدم و حوا دونوں سے لغزش سرزد ہوئی' دونوں نے شیطان کی ترغیب سے شجرِ ممنوعہ کھایا' دونوں کا ہبوط ہوا' پھر دونوں نے معافی مانگی جو خداوند رؤف و رحیم نے قبول کرلی (اس طرح عورت "گناہ

کی پوٹ اور دوزخ کا دروازہ" کے الزام سے بچ گئی اور آدم کی لغزش بھی معاف ہوگئی)۔ جس جنت میں انہیں **اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوعَ فِیهَا وَلَا تَعْرٰی وَاَنَّکَ لَاتَظْمَؤُا فِیهَا وَلَا تَضْحٰی** (۲۰:۱۱۹) کی بشارتیں دی گئی تھیں آب و نان اور لباس و مکان کی جنت انہیں خطۂ ارضی میں عطا کر دی گئی' زندگی کا ایک لائحہ عمل دے دیا گیا اور **لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا** کا نظامِ احتساب۔ مرد اور عورت کے تسکین دہ' مودّت کیش اور رحمت نثار عائلی نظام نے کائناتِ انسانی کو برکتوں سے بھر دیا' عورت بطور ماں تخلیقاتِ ہستی میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا خوبصورت اشارہ بن کر ابھری اور گناہِ توارث اور گناہِ مجسم کے غیر منطقی تصورات سے جو ذہنی گمراہی پھیلی تھی اس کی بڑی خوبی سے اصلاح ہوگئی --- **کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ** ہر انسان فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور **تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ** (۲:۱۳۴) ایک پورا نظامِ فکر ہے جس کی رو سے ہر انسان فطرتاً نیک ہے اور خواہ فرد ہو یا قوم اپنے اپنے اعمال کے لئے عند اللہ جواب دہ ہے۔ اگر حضرت آدم اور حضرت حوا سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے تو اس کا محاسبہ ہم سے نہیں ہونا ہے۔

قصہ آدم میں ہبوط آدم کے ساتھ ساتھ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ آدم کی تخلیق (CREATION) ہوئی تھی یا باقی انواع کے کسی سلسلۂ ارتقاء کے نتیجے میں وہ عالم وجود میں آیا تھا یعنی اس کا Evolution ہوا تھا۔ یہود' عیسائی اور مسلمان تخلیقِ آدمؑ پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے آدمؑ کی تخلیق کی۔ عیسائی اور یہودی محققوں نے ہبوطِ آدم کی تاریخی بنیادیں تلاش کرنے میں سعی بلیغ کی۔ جیمز اُس شیر (JAMES USSHER) آرچ بشپ آف آرماغ نے ۱۶۵۰ء میں دعویٰ کیا کہ ہبوطِ آدمؑ ۴۰۰۴ ق م میں وقوع پذیر ہوا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے سینٹ کیتھرائن کالج کے استاذ جان لائٹ فٹ (JOHN LIGHT FOOT) نے تاریخ اور وقت تک کا تخمینہ لگالیا اور اعلان کیا کہ ہبوطِ آدم ۲۳ اکتوبر کو صبح ۹ بجے ہوا۔ لیکن چارلس رابرٹ ڈارون (۱۸۰۹-۱۸۸۲) کے نظریۂ ارتقاء نے تخلیقِ آدم کے فلسفے کو متزلزل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ڈارون تجرباتی حیاتیات کا ایک سربرآوردہ قائد ہے۔ وہ ۳۶-۱۸۳۱ کے دوران میں ایک بحری جہاز بیگل (Beagle) میں عالمی مطالعاتی دورے پر روانہ ہوا اور

جنوبی امریکہ سے چھ سو میل کے فاصلے پر واقع جزیرے گاہ - لاہ - پاگس (GA_LA_PAGOS) اور دوسرے جزائر میں کچھوؤں اور چھوٹے چھوٹے پرندوں (FINCHES) پر تجربات کئے اور پھر مسلسل غور و خوض کے بعد اس نے ۱۸۵۹ میں THE ORIGIN OF SPECIES کے نام سے اپنا ثمرۂ افکار پیش کیا کہ

> Evolution of present day Morphology (branch of Biology dealing with forms) has been built up by gradual and opportunistic mechanism of Natural Selection.

یعنی آج کی مارفولوجی کے ارتقاء کی عمارت نیچرل سلیکشن کے تدریجی ارتقاء پر تعمیر ہوئی ہے اور اس نے نیچرل سلیکشن کی اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے

> I have called the principle by which each slight variation if useful is preserved by the term Natural selection (The Origin of Species, chapter 3)

> "میں نے اس اصول کو جس کی رو سے ہر معمولی سے معمولی فرق کو اگر اس کی کوئی افادیت ہے محفوظ رکھا جاتا ہے' نیچرل سلیکشن کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے۔"

○ ڈارون عملِ ارتقاء کے لئے دو باتوں کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ پہلی یہ کہ ایک نوع کے افراد میں GENETIC ضرور ہونی چاہئے۔ دوسری یہ کہ نیچرل سلیکشن متحرک ہو۔ ڈارون نیچرل سلیکشن کی تشریح میں بیان کرتا ہے کہ بنی نوعِ انسان کا ارتقاء کسی پست تر نوع سے ہوا ہے۔ ۱۸۷۱ء میں اس کی دوسری کتاب THE DESCENT OF MAN سے جہاں ماہرین نباتیات میں طمانیت کی لہر دوڑ گئی وہاں مذہبی علماء کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی اور انہوں نے ڈارون کے نظریات کی شدت سے مخالفت کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ان فطری انکشافات کا دارومدار مثلاً ۱۸۵۶ء میں جرمنی کے شہر DUSSELDORF کے نزدیک ۱۲۰۰۰۰ ق م کی مفروضہ کھوپڑی اور ہڈیوں پر ہے یا ۱۸۹۰ء میں دریافت شدہ KEDONG BREBUS JAVA کے چار لاکھ سال پہلے کے دانت پر ہے جو پیکنگ کے قریب ایک مقام CHOUKOUTIEN میں ۱۹۲۷ء میں ملا اور یہ بھی چار لاکھ سال

ق م کا بیان کیا جاتا ہے' یا بشریات کے ماہرین کے ۳۴ انکشافات میں آخری ایک لاکھ بیس ہزار سال پرانی کھوپڑی جو LOETOLI (واقع تنزانیہ) میں ۱۹۸۰ء میں کھدائی کے دوران میں ملی۔ گویا ان ۳۴ میں ۱۴ کھوپڑیاں' چار دانت ہیں' چار پانچ جبڑے ہیں' کیا ان تخمینوں اور مفروضات کی بنیاد پر زندگی کے ان ٹھوس حقائق کو جھٹلایا جا سکتا جو ہمارے روز مرہ کے مشاہدات میں آرہے ہیں اور پھر جینیات کے حقائق تو مسلمات کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ ڈارون خود ان اعتراضات کا جواب نہ دے سکا تھا جو اس کے معترضین نے اس کے نظریہ ارتقاء کے بارے میں کئے تھے۔ چنانچہ اس کا اعتراف ہے کہ

I can hardly reflect on them without being in some degree staggered (chapter 6)

مشہور ماہر ارتقائیات پروفیسر ڈوب ہیسکی (DOBZHAHSKY) اپنی کتاب THE BIOLOGICAL BASIS OF HUMAN FREEDOM میں کہتے ہیں:

There is no doubt that both the historical and the causal aspects of the Evolutionary Process are far from completely known.

چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار اس نظریے پر پہنچتا ہے کہ

The evidences are very imperfect and are often interrupted by gaps.

○ ایک سربرآوردہ ماہرِ حیات ڈبلیو لی گروس کلارک (W.LE GROS CLARK) اپنی کتاب The Fossil Evidence for Human Evolution میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ:

The chances of finding the fossil remains of actual ancestors or even representatives of local geographical group which provided the actual ancestors are so fantastically remote as not to be worth consideration.

ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا ۱۹۶۶ء کی یہ طنز بھی قابل لحاظ ہے کہ:

No one should make the mistake of saying that evolution is fully understood

اس تحقیقی فضا میں تہذیبِ انسانی کے ادوار کا صحیح ادراک ممکن نہیں ہے۔ دنیا کی ۲۶ تہذیبوں کی تحدید' AIOLITHIC کی مدت ۶ لاکھ سال ہے' اور PALEOLITHIC کی چار لاکھ سال' سیولی تھک دس ہزار' اور نیولوتھک کے BRONZE AGE اور IRON AGE کا تعین بھی نظریاتی رستوں اور عصبیتوں کے ساتھ ساتھ سکڑتا اور پھیلتا رہے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ارتقائے انسانی کی ان FORMATIONS کو شکم باور میں محدود کرتے ہیں اور یہی طریق کار جدید مفکرین نے اختیار کیا ہے۔ انسانوں اور بندروں کے کسی مشترک آباء و اجداد کا نظریۂ جنسیات کے ماہرین بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہر نوع کا بیضۂ تولید الگ الگ ہے' خواہ نباتات ہوں یا حیوانات۔ اور اس لحاظ سے اس کی تخلیق کا ایک طے شدہ Process ہے اور ایک بے خطا تشخص۔ البتہ فکری تضاد کا بحران جاری رہے گا۔ اور بقول حضرت اکبر الہ آبادی ۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا بُوزنہ ہوں میں
سن کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست

(جاری ہے)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

عظمت قرآن

بزبان قرآن و صاحبِ قرآن

کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ خود پڑھئے اور دوسروں تک پہنچایئے!

صفحات ۲۸' قیمت (عام ایڈیشن) ۔/۴ روپے' (اعلیٰ ایڈیشن) ۔/۷ روپے

علمِ تجوید کے فروغ کی اہمیت

کراچی سے جناب محبوب علی صاحب کا مکتوب

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

علمِ تجوید کی کتابوں سے پتہ چلا کہ :-

(۱) ہر قرآن پڑھنے والے پر لازم ہے کہ وہ اسے باتجوید پڑھے۔

(۲) نمازوں میں جتنا قرآن پڑھا جاتا ہے اتنے قرآن کی تجوید سیکھنا ہر نمازی پر فرض تک بتایا گیا ہے۔

(۳) قرآن کو غلط پڑھنا گناہ بتایا گیا ہے۔

راقم ناچیز نے محسوس کیا کہ ایسے واضح احکامات کے برخلاف اس بنیادی معلومات کے حصول میں صرف غفلت ہی غفلت دکھائی دیتی ہے۔ اس کلام کو صحیح پڑھنے کے معاملے میں ہم اجتماعی غفلت برت رہے ہیں۔ قراء حضرات کے سوا پوری قوم کو باتجوید قرآن پڑھنا نہیں سکھایا جاتا۔ علمائے دین (بشمول مفتی، محدث، مفسر، فقیہ) ائمہ مساجد، حفاظ اور معلمین قرآن کا بھی اکثر و بیشتر یہی حال ہے، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تجوید سکھانے سمجھانے پر محنت نہیں کی جاتی، نقل کرا کر پڑھانے میں Theory کو قطعی نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ عام استاد خود ہی تجوید نہیں جانتا تو شاگرد کو کیسے سکھا سکتا ہے؟ یوں نقل کے ذریعے قرآن سیکھنے والے طلباء حروف کی کنسٹرکشن سمجھنے سے محروم رہتے ہیں اور اپنی غلطی کا پتہ بھی نہیں لگا پاتے۔

میری سمجھ کے مطابق یہ مسئلہ درسِ نظامی پڑھانے والے بڑے چھوٹے مدرسوں کے مہتمم حضرات کی بے توجہی کا پیدا کردہ ہے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق بیشتر ایسے مدرسوں کے مہتمم حضرات خود علمِ تجوید سے آراستہ نظر نہیں آتے اور یوں اس شعبے کی کارکردگی نہیں جانچ پاتے۔ پھر کچے اساتذہ سے کام لیتے ہوئے پختہ بنیاد نہیں بنوا پاتے۔ مزید یہ کہ عالم بننے والوں کو بھی اس علم کا ماہر بننے پر پابند نہیں کرتے، یعنی باتجوید علماء و اساتذہ بھی تیار نہیں کئے جاتے۔ ملک کے حکام نے شاید اس جانب مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ قوم کو نہ تو صحیح پڑھے ہوئے قرآن کی پرکھ سکھائی گئی، نہ اس کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا۔ نہ ماضی میں فکر کی گئی، نہ آج ہے، نہ آئندہ کی تیاری ہو رہی ہے۔

ایسی شدید خستہ حالی کو خود علمائے دین کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے تیار کی ہوئی میری درخواست ("علم تجوید کے فروغ پر کار آمد تجاویز" نامی میری کتاب) آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب کی اشاعت (اپریل ۸۹ء) سے آج تک کے قلیل عرصے میں (جس میں دو مہینے کے کرفیو کی وجہ سے اور فنڈز بھی نہ ہونے کی وجہ سے کام بھی نہ ہو سکا) کئی خطوط' تأثرات اور تبصرے مجھے موصول ہوئے ہیں جن میں علمائے دین' معتمینِ مدارس اور اہم شخصیات بھی شامل ہیں۔ ان خطوط میں سے آدھے (دو درجن) خطوط کے فوٹو اسٹیٹ اس خط کے ساتھ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ میری طرف سے کئے ہوئے دیگر اقدامات کی مختصر تفصیل وغیرہ بھی ہیں جسے دیکھنے سے آپ اس مسئلہ کو واضح طور پر اور بخوبی سمجھ لیں گے۔

والسلام
محبوب علی

تعارفِ کتب

○ سیرت البم' مؤلف: شاہ مصباح الدین شکیل

ناشر: پاکستان سٹیٹ آئیل کمپنی لمیٹڈ داؤد سینٹر مولوی تمیزالدین خان روڈ کراچی

پاکستان سٹیٹ آئل کمپنی غالباً واحد ملکی ادارہ ہے جسے کاروبار کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کے کاموں میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہے۔ سیرت طیبہ پر متعدد گراں قدر تصانیف پر بیش قیمت "سیرت البم" کا اضافہ یقیناً قابل تحسین اور مبارک ہے جس میں مختلف خاکوں اور نقشوں کے علاوہ بہت سی خوبصورت اور نادر تصاویر جمع کی گئی ہیں۔ اس طرح تحریر اور تصویر کا ایک ایسا خوبصورت امتزاج وجود میں آیا ہے جس سے قاری کے ذہن میں سیرت النبیؐ کے کئی گوشے ازخود روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پاکستان سٹیٹ آئل کمپنی کے سربراہ' منتظمین اور کتاب کے مولف شاہ مصباح الدین شکیل صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی دلچسپی اور کاوش کے نتیجے میں یہ خوبصورت اور معلوماتی کتاب تیار ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو شرفِ قبول فرمائے۔

الحمد للہ کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی سے عمومی استفادے اور عربی زبان کی تحصیل کے لئے

خط و کتابت کورس

کا اجراء گذشتہ سالوں کے دوران ہو چکا ہے۔

○ پہلا کورس "قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی" کے زیر عنوان ہے' جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن کے ۴۴ کیسٹ اور چند کتب پر مشتمل ہے۔

○ دوسرا کورس ابتدائی عربی گرامر کی تدریس سے متعلق ہے جس میں "آسان عربی گرامر" سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن حکیم کا مفہوم براہ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تحصیل اشد ضروری ہے۔

سال ۱۹۹۳ء کے آغاز ہی سے خط و کتابت کورس میں داخلہ لیجئے اور گھر بیٹھے قرآن حکیم کی رہنمائی اور عربی زبان کی تدریس سے فائدہ اٹھایئے۔

نوٹ: ہر دو کورس کے پراسپکٹس' داخلہ فارم اور دیگر تفصیلات شعبہ خط و کتابت کورس' قرآن کالج' ۱۹۱۔ اے اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور سے طلب فرمائیں۔

فون: ۸۳۳۶۳۸-۸۳۳۶۳۷

٦

المعلن: مدیر شعبہ خط و کتابت کورس' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور